گوہر تاج: ایک آخری سوال۔ آپ نے 'روحانیات کی نفسیات' لکھنے کا فیصلہ کیسے کیا؟

خالد سہیل: اس کتاب کا سارا کریڈٹ Credit میرے کراچی کے پبلشر آصف صاحب کو جاتا ہے۔ وہ کئی مہینوں سے فرمائش کر رہے تھے کہ میں اس موضوع پر کتاب لکھوں۔ شروع میں میں انکار کرتا رہا وہ اصرار کرتے رہے آخر میں نے ان کے اصرار کے آگے گھٹنے ٹیک دیے اور اپنی کتاب Mysteries of Mysticism کے چند ابواب کا ترجمہ کر کے اردو میں ایک کتاب تیار کر دی۔ مجھ پر آصف صاحب کے بہت سے احسانات ہیں۔ یہ میرا ان کو ایک ادبی تحفہ ہے۔ جب میں نے انہیں فون پر خوشخبری سنائی کہ میں نے کتاب لکھ لی ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور ان کی خوشی سے مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ میں ان کے اخلاص اور محبت کی بہت قدر کرتا ہوں۔

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی و غیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈ من سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈ من سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

روحانیات کی نفسیات
ڈاکٹر خالد سہیل

CITY BOOK POINT
Naveed Square. Urdu Bazzar, Karachi
Ph # 021-32762483
E-mail: citybookurdubazaar@gmail.com

باذوق لوگوں کے لیے خوب صورت معیاری کتاب

بیاد

HASSAN DEEN

ادارہ City Book Point کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ ہمارے ادارے کے پیش نظر صرف تحقیقی کتب کی اشاعت ہے۔

کتاب : روحانیات کی نفسیات

مصنف : ڈاکٹر خالد سہیل

ناشر : City Book Point

تعداد : 500

سن اشاعت : 2017ء

قیمت : 200 روپے

روحانیات کی نفسیات

ڈاکٹر خالد سہیل

CITY BOOK POINT
Naveed Square. Urdu Bazzar, Karachi
Ph # 021-32762483
E-mail: citybookurdubazaar@gmail.com

تعارف

ایک وہ زمانہ تھا جب روحانیات کا ذکر صرف مذہبی کتابوں میں ملتا تھا۔ لیکن پچھلی دو صدیوں میں بہت سے طب' سائنس اور نفسیات کے ماہرین نے انسانی روحانیات پر تحقیق کی ہے اور روحانی تجربات کا سائنسی اور نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ اکیسویں صدی کے بہت سے سیکولر دانشوروں اور سائنسی محققین کا خیال ہے کہ روحانیت انسانیت کا حصہ ہے اور روحانی تجربات ایسے لوگوں کو بھی ہو سکتے ہیں جن کا کسی خدا اور مذہب پر ایمان نہ ہو۔ مذہبی لوگ روحانی تجربات کی تعبیر اور تفہیم اپنی مذہبی روایات کے حوالے سے کرتے ہیں اور ان کا تعلق اپنے خدا اور مذہب سے جوڑتے ہیں جبکہ سیکولر ماہرین ان تجربات کو انسانی دماغ' ذہن' شخصیت اور لاشعور کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ روحانیات کی نفسیات ایک نیا علم ہے جس نے پچھلی صدی میں کافی ترقی کی ہے۔

O

انسانی سائیکی: روح یا ذہن؟
Human Psyche: Soul or Mind?

انسانی تاریخ میں ایک وہ زمانہ تھا جب انسانی سائیکیHuman Psyche کا ترجمہ انسانی روحsoul کیا جاتا تھا۔روح پر ایمان رکھنے والوں کے دو گروہ تھے۔

پہلا گروہ ان لوگوں کا تھا جن کا عقیدہ تھا کہ روح انسانی جسم سے علیحدہ اپنا وجود رکھتی ہے جو عالمِ ارواح میں رہتی ہے۔ وہ روح رحمِ مادر میں بچے کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے'ساری عمر اس کے ساتھ رہتی ہے اور موت کے وقت جسم سے جدا ہو کر قیامت کا انتظار کرتی ہے۔قیامت کے دن اس کے اعمال کا حساب ہوگا۔ اگر اس شخص نے اپنی زندگی میں نیکیاں زیادہ کی ہیں تو وہ روح جنت میں چلی جائے گی اور اگر اس شخص نے اپنی زندگی میں بدیاں زیادہ کی ہیں تو وہ روح جہنم میں چلی جائے گی۔ بہت سے مسلمان' عیسائی اور یہودی آج بھی انسانی روح' یومِ حساب اور جنت دوزخ پر ایمان رکھتے ہیں۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جن کا عقیدہ تھا کہ انسانی روح بار بار اس دنیا میں آتی ہے اور پچھلے جنم کے اعمال کی بنیاد پر کسی جانور یا انسان کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ جب کوئی شخص جنم جنم کے ریاض کے بعد نروان حاصل کر لیتا ہے تو اس کی روح روحِ کل کا حصہ بن جاتی ہے اور دوبارہ دنیا میں نہیں آتی۔ بہت سے بدھ ازم اور ہندو ازم کے پیروکار آج بھی اواگون پر ایمان رکھتے ہیں۔

ان دونوں گروہوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ ایک ابدی زندگی پائیں۔ اس ابدی

زندگی کی خواہش نے ایک ابدی روح' ازلی و ابدی خدا' عالمِ ارواح اور روحِ کل کے تصورات' نظریات اور اعتقادات کو جنم دیا۔

پچھلی دو صدیوں سے ایک تیسرا نظریہ مقبول ہو رہا ہے۔ یہ سیکولر اور سائنسی نظریہ ہے۔ اس نظریہ کے ماننے والے انسانی سائیکی کا ترجمہ روح soul نہیں ذہن mind کرتے ہیں۔ اس ذہن کا تعلق انسانی دماغ Human Brain اور شخصیت Personality سے ہے۔ یہ ذہن انسانی جسم سے جدا نہیں جو انسان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ مر جاتا ہے۔ ذہن کا یہ تصور پچھلی دو صدیوں کے سائنسدانوں' ڈاکٹروں اور نفسیات دانوں کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ یہ ماہرین حیات بعد الموت اور جنت دوزخ پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانوں کی ایک ہی زندگی ہے اور انہیں پوری کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کو صحتمند' کامیاب اور بامقصد بنائیں۔ اس تیسرے گروہ کے لوگ انسان دوست ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر کرہِ ارض پر امن اور آشتی کی زندگی گزاریں۔ ساری دنیا میں ان لوگوں کی تعداد جو خدا' مذہب اور حیات بعد الموت پر ایمان نہیں رکھتے بڑھتی جا رہی ہے ۱۹۰۰ء میں عالمی طور پر ان کی تعداد ایک فیصد تھی جبکہ ۲۰۰۰ء میں ان کی تعداد بیس فیصد ہو گئی ہے۔ سکنڈینیوین Scandanavian ممالک میں ایسے لوگون کی تعداد پچاس فیصد سے بڑھ گئی ہے۔

وہ تمام طالبعلم جو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سائیکولوجی Psychology سائیکاٹری Psychiatry اور سائیکوتھیریپی Psychotherapy کے علوم کا مطالعہ کرتے ہیں وہ سائیکی Psyche کا ترجمہ ذہن کرتے ہیں روح نہیں۔ وہ انسان کے روحانی مسائل کی بجائے ان کے ذہنی مسائل کو سمجھنے اور پھر ان کا علاج کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک ماہرِ نفسیات Psychotherapist اور ایک انسان دوست Humanist ہونے کے ناطے میں بھی اسی تیسرے گروہ سے تعلق رکھتا ہوں۔

میں کینیڈا میں اپنے Creative Psychotherapy Clinic میں اپنے مریضوں کو ان کے ذہنی مسائل کو سمجھنے' ان کا حل تلاش کرنے اور ایک صحتمند زندگی گزارنے میں ان کی مدد کرتا ہوں۔ میری مریضوں میں مذہبی' روحانی اور سیکولر سبھی روایتوں کے

ماننے والے شامل ہیں۔ ان میں مسلمان بھی ہیں عیسائی بھی، یہودی بھی ہیں، ہندو بھی، سکھ بھی ہیں دہریے بھی۔ میں ان سب کا علاج کرتا ہوں۔ یہ میری خدمتِ خلق کرنے کی عاجزانہ کوشش ہے اور میری نگاہ میں انسانیت کی خدمت عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔

مذہب اور روحانیات

کیا ہر ثقافت کا کوئی مذہب ہوتا ہے؟
کیا ہر معاشرے میں خدا کا تصور پایا جاتا ہے؟
کیا ساری دنیا کے روحانی لوگ مشترک اقدار رکھتے ہیں؟
کیا تصوف ایک فلسفہ ہے‘ روحانی تجربہ ہے یا طرز زندگی؟
کیا کوئی شخص خدا اور مذہب کو مانے بغیر بھی درویش بن سکتا ہے؟

یہ چند ایسے سوال ہیں جو مذہب‘ سائنس‘ اور نفسیات کا طالبعلم ہونے کے ناطے میرے ذہن میں بار بار ابھرتے رہے ہیں اور میں ان کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔

جب ہم مختلف معاشروں کی مذہبی‘ روحانی اور سیکولر روایات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف قوموں میں ایک ہی لفظ کے مختلف معانی پائے جاتے ہیں اور ایک ہی عقیدے کی مختلف تفسیریں کی جاتی ہیں۔ علم و آگہی کے بڑھنے کی وجہ سے ہم ماضی کے تجربوں کا نئے انداز سے مشاہدہ اور تجزیہ کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ تاریخی اور معاشرتی فرق کے باوجود مختلف ثقافتوں میں بہت سی اقدار آج بھی مشترک ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مختلف اقوام کی مذہبی‘ روحانی اور سیکولر اقدار کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ اس گفتگو کا ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ ہم مذہب کے تصور سے کیا مراد لیتے ہیں۔

جب ہم کسی روایتی مذہب کا نام لیتے ہیں تو ہمارے ذہن میں خدا‘ پیغمبروں‘ آسمانی کتابوں‘ قیامت‘ جنت دوزخ‘ عبادگاہوں اور مذہبی رہنماؤں کے تصورات ابھرتے

ہیں۔ ایسے مذاہبِ عالم کی مثالیں اسلام، عیسائیت اور یہودیت ہیں۔ روایتی مذہب کے تصور میں بدھ ازم، جین ازم اور کمیونزم شامل نہیں ہوتے کیونکہ ان روایتوں میں خدا کا تصور موجود نہیں ہے۔

جیفری پرنڈر Geoffery Parrinder لکھتے ہیں' بدھ ازم کی طرح جین ازم میں بھی خالق کا تصور موجود نہیں ہے' (Ref 1) لیکن اگر زندگی کا ہر فلسفہ مذہب کہلایا جا سکتا ہے تو پھر بدھ ازم اور کمیونزم بھی مذاہب کہلائے جا سکتے ہیں یہ علیحدہ بات کہ بدھا اور مارکس کے پیروکار اسے اپنی توہین سمجھیں گے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا فلسفہ روایتی مذہب سے مختلف ہی نہیں اس کی ضد بھی ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ بدھ ازم ایک فلسفے کے طور پر شروع ہوا تھا لیکن تنزل کی راہ اختیار کرتے کرتے مذہب بن گیا۔ مارکس بھی اندھے ایمان کے خلاف تھا اور مذہب کو افیون سمجھتا تھا۔

مذہبی دنیا میں بعض لوگ مذہب کے سماجی اور معاشرتی پہلو organization/ institution پر زور دیتے ہیں اور بعض اس کے نفسیاتی اور روحانی پہلو پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ صوفیا وہ لوگ ہیں جو خدا سے بلا واسطہ تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کسی مولوی، کسی پادری یا ربائی کی وساطت سے نہیں۔ صوفیا زندگی کے بارے میں غور وخوض کرتے ہیں اور کائنات کے اسرار و رموز جاننے کی کوش کرتے ہیں۔ صوفیا مولویوں کی طرح تبلیغ اور تقریریں کرنے سے احتراز کرتے ہیں اور خاموشی سے اپنی ذات کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔

Lewis کا خیال ہے کہ تمام مذاہبِ عالم میں روحانیات کا پہلو موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ایسا مذہب تلاش کرنا مشکل ہے جس کے مرکز میں خدا سے قربت کا تصور نہ پایا جاتا ہو۔ وہ لوگ جو روحانیت کی راہ پر چل نکلتے ہیں مختلف معاشروں میں سنت، سادھو، صوفی، سائیں، قلندر اور درویش کہلاتے ہیں۔ (Ref 2)

O

روحانیات کی روایات

جب ہم روحانیات کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں تین جداگانہ روایات ملتی ہیں

ا۔ ہمہ از اوست کی روایت Theistic Tradition

اس روایت کی پیروی کرنے والے لوگ ایک ایسے خالق اور مالک کا تصور رکھتے ہیں جو اس کائنات سے جدا ہے لیکن اس سے براہِ راست تعلق قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہودیت' عیسائیت اور اسلام کو ماننے والے کئی صوفی اس روایت کو ماننے والے ہیں۔

۲۔ ہمہ اوست کی روایت Monistic Tradition

اس روایت کو ماننے والے کائنات سے جدا کسی خدا کو نہیں مانتے بلکہ کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو موجود ہے خدا ہے۔ اسی لیے ان کا خدا آسمانوں پر نہیں انسانوں کے دلوں میں بستا ہے اور لوگ اس سے بلا واسطہ تعلق قائم کر سکتے ہیں۔ ہندوازم کے کئی سنت اور سادھو اس روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳۔ سیکولر روایت Secular Mysticism

اس روایت کو ماننے والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہر انسان کی شخصیت کا ایک پہلو درویشانہ ہوتا ہے اور اس کو پروان چڑھانے کے لیے کسی خدا یا مذہب کو ماننے کی ضرورت

نہیں ہوتی۔ اس روایت کو ماننے والے فطرت سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور اپنی ذات کی گہرائیوں پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ مشرق میں بہت سے بدھا' کنفیوشس اور شنتو کے پیروکار اور مغرب میں انسان دوستیHumanism کے فلسفے کو ماننے والے اس روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہوسکتا ہے بعض لوگوں کی نگاہ میں ان روایتوں کا فرق اہم نہ ہو لیکن روحانیات کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مختلف ادوار میں بہت سے درویشوں نے اپنے نظریات اور طرزِ زندگی کی وجہ سے بہت سی صعوبتیں برداشت کیں۔ بہت سے مسلم صوفیا نے جب ہمہ اوست کا فلسفہ اپنایا تو ہمہ از اوست کے فلسفے کو ماننے والوں نے یا انہیں جیل بھیج دیا یا سولی پر چڑھا دیا۔ منصور حلاج کے بارے میں کون نہیں جانتا جن کا نعرہ 'اناالحق' انہیں تختہِ دار تک پہنچانے کے لیے کافی تھا۔

سیکولر درویش فطرت سے خاص تعلق رکھتے ہیں اور اپنی شخصیت کے روحانی پہلو کی تربیت پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں ہماری روحانیت ہماری انسانیت کا ہی حصہ ہے خدائی کا نہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر سیکولر روحانیت کیا ہے؟ بدھا کا کہنا ہے کہ روحانی دنیا نام اور ہیئت سے ماورا ہے۔ کرشنا مورتی کا خیال ہے کہ سچائی کا نہ کوئی رستہ ہے اور نہ کوئی رہبر۔ ہر شخص کو اپنے انداز سے اپنا سچ اور اپنی روحانیت تلاش کرنے ہوں گے۔

مادی دنیا میں چیزوں کے نام ہوتے ہیں اور وہ زمان و مکان کی پابند ہوتی ہیں۔ روحانیت کا پیروکار ان تمام پابندیوں کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ جب ہم حافظ' رومی' بابا فرید' بلھے شاہ' ولیم بلیک' کبیر داس' رابندر ناتھ ٹیگور اور والٹ وٹمین کی شاعری پڑھتے ہیں تو ہمیں اس دنیا کی چند جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ روحانی دنیا کے بارے میں منطقی انداز سے گفتگو کرنا مشکل کیا ناممکن ہے۔

تاریخی حوالے سے روحانی دنیا میں کئی روایات نے فروغ پایا ہے۔ بعض نے رہبانیت کی ترغیب دی ہے اور ترکِ دنیا کا سبق پڑھایا ہے اور بعض نے زندگی اور معاشرے سے کنارہ کشی اختیار کو معیوب سمجھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان اپنے خاندانوں اور معاشروں میں رہ کر بھی روحانی منازل کرسکتا ہے۔

بدھا نے جوانی میں جنگل کا سفر کیا تھا لیکن نروان حاصل کرنے کے بعد دوبارہ دنیا میں لوٹ آئے تھے اور دوسروں کو روحانیت اور سچ کی تلاش کا درس دینا شروع کر دیا تھا تا کہ وہ اپنی دانائی دوسروں تک پہنچا سکیں۔ بدھا کا کہنا تھا کہ اپنے سچ کی تلاش اور خدمتِ خلق ایک ہی روحانی حقیقت کے دو رخ ہیں۔

درویشانہ شخصیت Mystic Personality

ایک نفسیات کے طالبعلم ہونے کے ناطے میں روحانیات کے مذہبی اور فلسفیانہ پہلوؤں کی نسبت اس کے نفسیاتی پہلو میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں مختلف سنتوں' سادھوؤں' صوفیوں اور درویشوں کی سوانح عمریاں پڑھتا رہتا ہوں تا کہ یہ جان سکوں کہ روحانیت کا رستہ اختیار کرنے کے بعد ان کے طرزِ زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں۔میرا خیال ہے کہ اکثر درویشوں کی شخصیت میں مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۱۔ قناعت

درویش قناعت پسند انسان ہوتے ہیں۔انہیں اس حقیقت کا احساس ہو جاتا ہے کہ بہت سے لوگ اس مادی دنیا میں اپنی حرص کی وجہ سے دکھی رہتے ہیں۔ وہ حریص لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان کے پاس بڑا سا گھر' بہت سی کاریں' کشتیاں' عیاشی کا سامان اور بینک میں بہت سے ڈالر ہوں گے تو وہ خوش ہوں گے لیکن درویش جانتے ہیں کہ وہ سب سراب ہے۔ جب کوئی شخص حریص ہو جاتا ہے تو وقت کے ساتھ ساتھ اس کی حرص کم ہونے کی بجائے بڑھتی جاتی ہے۔پہلے وہ ہزاروں ڈالر جمع کرتے ہیں پھر وہ لکھ پتی بننا چاہتے ہیں اور پھر کڑوڑ پتی۔ درویش یہ راز جان لیتے ہیں کہ زندگی ایک سمندر ہے اور انسانی دل ایک کشتی۔ جب تک کشتی میں سوراخ نہ ہو وہ تیرتی رہتی ہے لیکن جوں ہی اس

کے پیندے میں سوراخ ہو جاتا ہے اور پانی اندر آنا شروع ہو جاتا ہے تو اندر آنے والا تھوڑا سا پانی سمندر کے لامتناہی پانی سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے اور کشتی کو لے ڈوبتا ہے۔ جب لوگوں کے دلوں میں کسی بھی چیز کی حرص داخل ہو جاتی ہے تو وہ انہیں پریشان رکھتی ہے۔

درویش سمجھتے ہیں کہ ان کی دولت اور ان کے بچے ان کے نہیں ہیں۔وہ زندگی کی امانت ہیں۔

بدھا نے کہا تھا' جب انسان کی اپنی ذات بھی اس کی اپنی نہ ہو تو دولت اور بچے کیسے اس کے ہو سکتے ہیں'۔

خلیل جبران نے اپنی کتاب پیغمبر (Prophet (Ref 4 میں لکھا ہے

'ایک عورت جس نے اپنے بچے کو گود میں اٹھایا ہوا تھا پوچھا' ہمیں بچوں کے بارے میں بتاؤ'

اس نے کہا 'تمہارے بچے تمہارے نہیں ہیں
یہ زندگی کی امانت ہیں
انہیں اپنی محبت دو مگر اپنے خیالات نہ دو
کیونکہ ان کے اپنے خیالات ہیں
تم ان کے جسموں کا خیال رکھ سکتے ہو روحوں کا نہیں
ان کی روحیں فردا کے لیے ہیں جہاں تک تمہاری رسائی نہیں
خوابوں میں بھی نہیں'

بہت سے ایسے درویش جنہوں نے دنیاوی زندگی کو خیرباد کہہ کر درویشانہ زندگی اختیار کی ان میں ابراہیم ادھم بھی شامل تھے۔ وہ معرفت کی راہ اختیار کرنے سے پہلے بہت مالدار تھے۔ کہاوت ہے کہ ایک رات وہ محل میں سو رہے تھے کہ محل کی چھت پر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ انہوں نے بآوازِ بلند پوچھا

'چھت پر کیا کر رہے ہو؟

'میں اپنا کھویا ہوا اونٹ تلاش کر رہا ہوں'

ابراہیم ادھم ہنسے اور کہنے لگے 'کیا کبھی کوئی اونٹ چھت پر بھی ملتا ہے؟'
وہ شخص بھی زور سے ہنسا اور بولا 'اور کیا خدا محلوں میں ملتا ہے؟'
اگلے دن ابراہیم ادھم نے محل کو خدا حافظ کہا اور معرفت کی تلاش میں جنگل کی طرف چل دیے۔

میرا ایک شعر ہے

دوست احباب بڑے شوق سے ملنے آئے
ہم جو گھر چھوڑ کے جنگل کو چلے ہیں چپ ہیں

۲۔ منکسر المزاجی

درویش منکسر المزاج ہوتے ہیں۔ وہ انسانوں کا احترام کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کو ان کے نام' خاندان اور دولت کی بجائے ان کے کردار کی وجہ سے پرکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ سب انسان برابر ہیں۔ وہی انسان بہتر ہیں جن کا کردار اعلیٰ ہے۔ درویش رنگ' نسل' اور زبان کے تعصّبات سے بالاتر ہوتے ہیں۔ درویش لوگوں پر مولویوں کی طرح فتوے لگانے کی بجائے ان کو خامیوں سمیت قبول کرتے ہیں اور دل سے لگاتے ہیں۔

ایک کہاوت ہے کہ ایک محل میں ایک وزیر رہتا تھا۔ وہ ہر رات سونے سے پہلے ایک کوٹھڑی میں جاتا تھا۔ لوگوں کو پتہ نہ تھا کہ اس کوٹھڑی کا راز کیا ہے۔ جب وہ وزیر مرنے لگا اور لوگوں نے راز پوچھا تو وزیر نے کہا کہ ایک زمانے میں وہ گداگر ہوا کرتا تھا۔ اس نے کوٹھڑی میں وہ گدڑی سنبھال کر رکھی تھی اور ہر رات سونے سے پہلے دیکھتا تھا تا کہ وہ مغرور اور متکبر نہ ہو جائے۔ اس وزیر کی منکسر المزاجی نے ساری قوم کا دل موہ لیا تھا اور وہ اس کا احترام کرتے تھے۔ سعدی شیرازی فرماتے ہیں

ایک بارش کا قطرہ
جب سمندر کے پاس آیا تو شرمندہ ہوا
سوچنے لگا

میں اس سمندر کے آگے کتنا ناچیز ہوں
اس قطرے کی ندامت دیکھ کر
ایک سیپ کو اس پر پیار آ گیا
اور بڑھ کر اسے گلے لگا لیا (Ref 5)

اس طرح وہ قطرہ اپنی منکسرالمزاجی کی وجہ سے موتی بن گیا۔ درویش جانتے ہین کہ انسان کی اپنی انا اس کی معرفت کے سفر کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے
میرا ایک شعر ہے

سفر میں خود ہی حائل ہو گیا ہوں
میں اپنا راستہ روکے کھڑا ہوں

۳۔ عذاب و ثواب سے بالاتر

بہت سے لوگ بچوں کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ اچھے کام کریں تو اس کی جزا چاہتے ہیں اور برے کام کریں تو سزا کی امید رکھتے ہیں۔ جو لوگ معرفت کی منزلیں طے کر چکے ہوتے ہیں وہ بڑے مقاصد کے لیے چھوٹے مقاصد اور بڑی خوشیوں کے لیے چھوٹی خوشیاں قربان کر سکتے ہیں۔ بعض لوگ اس دنیا میں قربانیاں دیتے ہیں تا کہ اخروی زندگی میں جنت میں جا سکیں اور جہنم سے بچ سکیں۔

درویش معرفت کی اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں انہیں نہ تو جنت کی خواہش ہوتی ہے نہ جہنم کا خوف۔ ایک کہاوت ہے کہ ایک دفعہ رابعہ بصری ایک ہاتھ میں آگ اور دوسرے ہاتھ میں پانی لیے جا رہی تھیں۔ کسی نے پوچھا آپ کہاں جا رہی ہیں کہنے لگیں میں جنت کو آگ لگانے اور پانی سے جہنم کی آگ کو بجھانے جا رہی ہوں تا کہ لوگ جنت کی طمع اور جہنم کے خوف سے نیکی نہ کریں۔

۴۔ من کا سکون

درویش اس طرح زندگی گزارتے ہیں کہ ان کے دلوں سے حزن' پریشانی اور دکھ نکل جاتے ہیں اور من میں آشتی اور سکون پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ ساری دنیا کو تو نہیں بدل سکتے لیکن اپنے دل کو بدل لیتے ہیں۔ وہ زندگی کو قبول کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ ان کی گفتار و کردار کے تضادات آہستہ آہستہ کم ہوتے جاتے ہیں۔ وہ چونکہ خود پرسکون ہوتے ہیں ان کی قربت میں باقی لوگ بھی پرسکون محسوس کرتے ہیں۔ بدھا نے کہا تھا ' اگر کوئی انسان خلوصِ دل سے گفتگو اور کام کرتا ہے خوشی اور سکون اس کا سایہ بن جاتے ہیں' Ref 3

۵۔ مذہبی اداروں کو چیلنج کرنا

بہت سے درویشوں کا خیال ہے کہ مولویوں اور پادریوں نے مسجدیں' گرجے اور مندر بنا کر معرفت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ انسانوں کو اپنا سچ تلاش کرنے کے لیے ان مذہبی رہنماؤں اور اداروں کی ضرورت نہیں۔ ایسے رہنما مذاہب اور عوام کا استحصال کرتے ہیں۔ چنانچہ درویش عوام کو بتاتے ہیں کہ ان مولویوں' پنڈتوں اور پادریوں کی پیروی نہ کرو۔ جب روایتی مذہبی رہنما ان درویشوں کی غیر روایتی باتیں سنتے ہیں تو سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ کبیر داس کہتے ہیں

او برہمن
میں صرف وہ کہتا ہوں جو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں
اور تم
آنکھیں بند کر کے آسمانی کتابیں دہراتے ہو
میں زندگی کی گتھیاں سلجھاتا ہوں
تم انہیں مزید الجھانا چاہتے ہو
ہم ایک دوسرے کے ساتھ کیسے مکالمہ کر سکتے ہیں؟ (Ref 7)

جب برہمنوں' پادریوں اور مولویوں کو اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ سنت' سادھو اور درویش مذہبی روایات اور توہمات کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو وہ درویشوں کے خلاف ہو جاتے ہیں اور انہیں طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دینی پہنچانا شروع کر دیتے ہیں۔ جن درویشوں نے ان مصائب کا سامنا کیا ان میں سے ایک منصور حلاج تھے جو ایک درویش شاعر تھے۔ جب انہوں نے 'اناالحق' کا نعرہ لگایا اور روایتی مذاہب کو چیلنج کیا تو انہیں بغداد میں سولی پر چڑھا دیا گیا۔

درویش روایتی مذہب کی راہ چھوڑ کر معرفت کی راہ اور شریعت کی راہ چھوڑ کر طریقت کی راہ اختیار کرتے ہیں اور آخر میں اپنا سچ تلاش کر لیتے ہیں۔ بدھا نے کہا' ہر انسان کا اپنا تجربہ اس کا سب سے بڑا رہنما ہے'۔

٦۔ خدمتِ خلق

درویش لوگ روایتی مذہبی لوگوں کی طرح تبلیغ نہیں کرتے بلکہ خدمتِ خلق کرتے ہیں۔ وہ جس چیز پر ایمان رکھتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔

درویشوں کے دلوں میں انسانیت کی ہمدردی ہوتی ہے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کے دکھ کم کریں' ان کے سکھ زیادہ کریں اور وہ اس خدمت میں چھوٹے بڑے اور امیر غریب کی تمیز نہیں کرتے۔ وہ انسان دوست ہوتے ہیں ۔اس لیے ان سے دوسرے انسانوں کا دکھ درد دیکھا نہیں جاتا۔

مدر ٹیریسا Mother Teresa کلکتے میں ان تمام لاوارثوں کی خدمت کرتی تھیں جو کلکتے کی گلیوں میں اور بازاروں میں موت کا انتظار کر رہے ہوتے تھے۔ وہ انہیں اپنے گھر لے آتی تھیں کیونکہ ان کا ایمان تھا کہ کسی انسان کو اکیلے نہیں مرنا چاہیے۔ کسی نے پوچھا تھا کہ آپ ایسا کیوں کرتی ہیں تو وہ کہنے لگیں مجھے ان لاوارثوں کے چہرے میں عیسیٰ نظر آتے ہیں۔ شاید اسی لیے مدر ٹریسا کی شخصیت میں پاکستان کے عبدالستار ایدھی کی طرح مسیحائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ والٹ وٹمین Walt Whitman جو امریکہ کے

درویش شاعر تھے وہ بھی جنگ کے دوران واشنگٹن کے ہسپتال جاتے تھے اور بیمار سپاہیوں کی خیال رکھتے تھے۔ والٹ وٹمین کی ہمدردی اور مسیحائی صرف اپنی قوم کے لوگوں تک محدود نہ تھی بلکہ ساری انسانیت کے لیے تھی۔ ان کی ایک نظم کی چند لائنیں ہیں

میرے سامنے میرے دشمن کی لاش پڑی ہے
وہ بھی انسان ہے' میری طرح مقدس انسان
میں اس پر جھکتا ہوں اور
اس کی پیشانی کو بوسہ دیتا ہوں Ref 6

درویشوں کو اپنے دشمنوں میں بھی انسان نظر آتے ہیں۔

O

REFERENCES

1. Parrinder Geoffery...Mysticism in the World Religions Oneworld Oxford 1976
2. Lewis I M ...Ecstatic Religion England 1971
3. Buddha...Dhamapada...Translation by Thomas Cleary Bantam Books USA 1995
4. Gibran Khalil...Prophet.....Jarco Publishing House USA
5. Shah Idrees ...The Way of the Sufi...Penguin Books England 1968
6. Sohail Khalid...From Islam to Secular Humanism Abbeyfield Publishers Canadan 2001
7. Kuman Sehdev...The Vision of Kabir ...Alpha and Omega Books Canada 1984

عارفانہ شاعری کے استعارے

جب ہم عالمی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہر عہد، ہر مذہب اور ہر قوم میں چند شعرا ایسے تھے جنہوں نے عارفانہ شاعری کی جس میں روحانی شاعری بھی شامل تھی۔ان شاعروں کی فہرست میں کبیر داس، رابندر ناتھ ٹیگور، بلھے شاہ، جلال الدین رومی، مادھو لال حسین، ولیم بلیک اور والٹ وٹمین سبھی شامل ہیں۔ایسے شاعر مادی دنیا اور خارجی مشاہدات اور تجربات کی بجائے داخلی سچائیوں، داخلی صداقتوں اور روحانی تجربات پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔

جب ہم عارفانہ شاعروں کا سنجیدگی سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہ شاعر اپنے خیالات، نظریات اور تجربات کے اظہار کے لیے چند استعارے استعمال کرتے ہیں۔ میں اس مضمون میں ان استعاروں میں سے چند ایک کا ذکر کروں گا۔

عارفانہ شاعری کا پہلا استعارہ پانی ہے۔ انسانی زندگی کی بقا کے لیے پانی بہت ضروری ہے۔اس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ کرۂ ارض پر زندگی کی ابتدا بھی پانی سے ہوئی اور انسانی جسم کا بیشتر حصہ بھی پانی پر مشتمل ہے۔

عارفانہ شاعر انسانی شعور کو پانی کے قطرے سے اور آفاقی شعور کو سمندر سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ عام انسان سمندر میں پانی کے قطرے دیکھتا ہے لیکن ایک عارف، ایک سادھو، ایک سنت، ایک صوفی پانی کے قطرے میں سمندر دیکھتا ہے۔

کبیر داس کہتے ہیں

ایک قطرہ

سمندر کا حصہ ہے
یہ تو
سب انسان سمجھتے ہیں
لیکن کس طرح
سارا سمندر
ایک قطرے میں موجود ہے
یہ صرف چند لوگ
ہی دیکھ سکتے ہیں
ایسے لوگ عارف ہیں جن پر زندگی کے راز منکشف ہوتے ہیں۔

عارفانہ شاعری کا دوسرا استعارہ آگ ہے۔ بعض سنتوں، سادھوؤں اور صوفیوں کا خیال ہے کہ روحانی سفر آگ میں چھلانگ لگانے کی طرح ہے۔ جب عام انسان آگ میں چھلانگ لگاتا ہے تو وہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ جب ایک صوفی آگ میں چھلانگ لگاتا ہے تو وہ آگ گلستان بن جاتی ہے۔

عام انسان جل جاتا ہے صوفی کندن بن جاتا ہے۔

جلال الدین رومی فرماتے ہیں
محبت ایک شعلہ ہے
جب بھڑکتا ہے
سب کچھ جل جاتا ہے
خدا باقی رہ جاتا ہے

کبیر داس فرماتے ہیں
سچ کی تلاش
آگ میں جلنا ہے
اگر تم اس تلاش میں سچے نہیں
تو جل جاؤ گے
سچے ہو تو

کندن بن جاؤ گے

میرا ایک شعر ہے

زیست کی آگ میں جل جل کے فغاں کرتے رہے
اور اس آگ میں کندن جو بنے ہیں چپ ہیں

عارفانہ شاعری کا تیسرا استعارہ روشنی ہے۔عارف سمجھتے ہیں کہ جب انسان سچ کی تلاش میں اپنی ذات کی تاریکیوں سے گزرتا ہے تو روشنی اس کا استقبال کرتی ہے۔یہ روشنی کہاں سے آتی ہے؟

بابا فرید الدین عطارؔ فرماتے ہیں

سچا عاشق
ایک موم بتی کی طرح ہے
وہ خود اپنے آپ کو جلاتا ہے
روشنی پاتا ہے

ایک درویش کا کہنا ہے روحانی سفر کی تین منازل ہیں

پہلی منزل ۔۔تم روشنی کی طرف جاتے ہو
دوسری منزل۔۔تم روشنی میں داخل ہوتے ہو
تیسری منزل۔۔تم روشنی بن جاتے ہو

عارف جب روشنی بنتا ہے تو دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بن جاتا ہے

میرا ایک شعر ہے

میں اپنی ذات کی گہرائیوں میں جب اترتا ہوں
اندھیروں کے سفر میں روشنی محسوس کرتا ہوں

عارفانہ شاعری کا چوتھا استعارہ خاموشی ہے۔جب سنت سادھو اور صوفی معرفت کی منازل طے کرتے ہیں تو باتیں کم کرنے لگتے ہیں۔وہ خاموشی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں۔

مادھو لال حسین فرماتے ہیں

لمبی لمبی بحثوں میں مت الجھو
خاموش رہو

اپنے انجام کے بارے میں غور کرو

کبیر داس فرماتے ہیں

جب عاشق

محبوب کو پا لیتا ہے

تو خاموش ہو جاتا ہے

اے دوست

جب کسی کو

ہیرا مل جاتا ہے

وہ بازار میں جا کر نہیں چیختا

وہ خاموش ہو جاتا ہے

جب سنت سادھو اور صوفی معرفت حاصل کر لیتے ہیں تو وہ یا تو خاموش ہو جاتے ہیں اور یا عام فہم زبان میں اپنے جذبات' خیالات اور تجربات کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے عالموں' ناقدوں اور دانشوروں کی طرح موٹے موٹے مشکل الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ان کے الفاظ سے ان کی عاجزی اور انکساری جھلکتی ہے۔ وہ عام انسانوں سے خطاب کرتے ہیں اور انہیں زندگی کی بصیرتوں کے تحفے پیش کرتے ہیں۔رومی فرماتے ہیں

ساری دنیا

لفظوں سے مسحور ہے

میں اس کا غلام ہوں

جو خاموشی کا شہنشاہ ہے۔

سنتوں' سادھوؤں اور صوفیوں پر اپنے روحانی سفر میں یہ منکشف ہو جاتا ہے کہ خاموشی' تنہائی اور دانائی کا گہرا رشتہ ہے۔

O

سدھارتھا کا روحانی سفر

روحانیات اور روحانی سفر کے بارے میں میں نے جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان سب میں سے سدھارتھا میری سب سے پسندیدہ کتاب ہے جو ہرمن ہیس Herman Hesse کی تخلیق ہے جس میں انہوں نے بدھا کی کہانی کو ایک ناول بنا کر پیش کیا ہے۔ میں نے وہ ناول کئی دفعہ پڑھا ہے اور بہت سے دوستوں کو تحفے کے طور پر پیش کیا ہے۔ میں جب بھی اس ناول کو پڑھتا ہوں مجھے اس سے ایک نئی بصیرت ملتی ہے۔ ہرمن ہیس نے بدھا کے عمر بھر کے روحانی سفر کو صرف ایک سو صفحوں میں بیان کر دیا ہے۔ جو ایک تخلیقی معجزہ ہے۔اس سفر کے آغاز میں وہ سدھارتھ ہوتا ہے اور انجام میں وہ بدھا بن جاتا ہے۔

جب ہم بدھا کی کہانی تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک مالدار گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور ہندوستان میں ۵۵۰ قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا۔ بدھا کی ایک محل میں پرورش کی گئی تھی۔ اسے محل سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جوتشیوں نے بدھا کے باپ سے کہہ رکھا تھا کہ اگر بدھا نے محل سے باہر قدم رکھا اور اس نے زندگی کے چند حقائق دیکھے تو عین ممکن ہے کہ وہ محل چھوڑ کر جنگل میں چلا جائے اور بادشاہ بننے کی بجائے ایک سادھو بن جائے۔ بدھا کے والد نے بہت کوشش کی کہ وہ محل سے باہر نہ جائے لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہوا۔

ایک دن بدھا محل کے شمالی دروازے سے باہر گیا اور اسے راستے میں ایک اپاہج

روتا ہوا نظر آیا۔ نوکروں نے بتایا کہ وہ کوڑھ کا مریض ہے۔

اگلے ہفتے جب بدھا محل کے جنوبی دروازے سے باہر گیا تو اس نے ایک ایسے آدمی کو دیکھا جس کی کمر جھکی ہوئی تھی اور وہ ایک لاٹھی کے سہارے چل رہا تھا۔ نوکروں نے بتایا کہ وہ شخص بوڑھا ہو گیا ہے۔

تیسرے ہفتے جب بدھا محل کے مشرقی دروازے سے باہر گیا تو اسے ایک بے جان شخص نظر آیا جو ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ نوکروں نے بتایا کہ وہ شخص مر چکا ہے اور لوگ اس کی لاش جلانے کا انتظام کر رہے ہیں۔

چوتھے ہفتے جب بدھا محل کے مغربی دروازے سے باہر گیا تو اس نے ایک ایسا شخص دیکھا جو نیم برہنہ تھا اور خود سے باتیں کر رہا تھا۔ نوکروں نے کہا کہ وہ سادھو ہے اور اس نے دنیا تیاگ دی ہے۔

جب بدھا کا بیماری، بڑھاپے، موت اور روحانیت سے تعارف ہو گیا تو جوتشی کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور بدھا نے فیصلہ کیا کہ وہ محل چھوڑ کر جنگل میں چلا جائے گا، رہبانیت اختیار کر لے گا اور سنیاسی بن جائے گا۔ بدھا کے والد کو جب بدھا کے سنیاسی ہونے کا پتہ چلا تو وہ بہت مایوس ہوئے۔ ہرمن ہیس لکھتے ہیں

'سدھارتھ نے اپنے والد سے کہا کہ میں آپ سے اجازت لینے آیا ہوں کہ میں کل گھر چھوڑ کر جنگل چلا جاؤں گا تا کہ میں سنیاسی بن سکوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ مجھے اس کی اجازت دیں گے۔ والد نے کہا کہ کسی برہمن کو سخت الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں لیکن میرا دل خوش نہیں ہے۔ میں تمہارے منہ سے دوبارہ یہ الفاظ نہ سنوں'۔

اس گفتگو کے بعد سدھاتھا کے والد کمرے سے باہر چلے گئے لیکن سدھارتھا وہیں کھڑا رہا۔ سدھاتھا نے اپنے دل میں فیصلہ تو کر لیا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے لیکن وہ چاہتا تھا کہ اسکے والد اسے آشیرباد دے دیں۔ جب سدھارتھا کے والد آدھی رات کو جاگے اور کھڑکی سے باہر دیکھا تو سدھاتھا کمرے میں وہیں کھڑا تھا جہاں وہ اسے چھوڑ کر آئے تھے۔ ساری رات جب بھی وہ جاگتے سدھاتھا کو اسی جگہ کھڑا پاتے۔ صبح ہونے تک انہیں اندازہ ہو گیا کہ سدھارتھا کا ارادہ مصمم ہے۔ ہرمن ہیس لکھتے ہیں 'جب صبح کی روشنی

کمرے میں داخل ہوئی تو برہمن نے دیکھا کہ سدھارتھا کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں لیکن اس کا چہرہ پرسکون ہے۔اس کی آنکھیں دور خلاؤں میں دیکھ رہی ہیں۔ سدھارتھا کے والد کو اندازہ ہو گیا کہ ان کا بیٹا ان کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتا۔ وہ کب کا جا چکا ہے۔'

بدھا کے دور کے ہندوستان میں سنت سادھو بننے والے لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں چلے جایا کرتے تھے۔ وہ منافق دنیا سے دور ہٹ کر فطرت کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ وہ اپنے روحانی سفر کے لیے اپنی مادی زندگی کی قربانی دیتے تھے۔وہ جنگلوں، پہاڑوں اور وادیوں میں کئی سال اور کئی دہائیاں گزارتے تھے۔ فاقہ کشی کرتے تھے، اپنے نفس کو مارتے تھے تا کہ تمام خواہشات سے دستبردار ہو سکیں۔ وہ خوشی اور غم، دکھ اور سکھ دونوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتے تھے۔

ہرمن ہیس لکھتے ہیں' سدھارتھا کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا۔ وہ اپنے من کو خالی کرنا چاہتا تھا۔۔۔بھوک سے۔۔پیاس سے۔۔خواہشات سے۔۔خوابوں سے۔۔دکھ سے۔۔سکھ سے۔ وہ اپنا نفس مارنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل میں سکون حاصل کرنا چاہتا تھا۔وہ اپنی انا اپنی نرگسیت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ وہ نروان حاصل کرنا چاہتا تھا۔

ہرمین ہیس لکھتے ہیں کہ سدھارتھا جب اپنے سفر پر نکلا تھا تو اس کے ساتھ اس کا دوست گوندا بھی تھا۔ گوندا نے دیکھا کہ جب سدھارتھا نے سلوک کی منزلیں طے کرنی شروع کیں تو اس نے باتیں کرنی کم کر دیں اور خاموشی اختیار کر لی۔

آہستہ آہستہ سدھارتھا نے معرفت کی منازل طے کیں اور نروان حاصل کر لیا۔

بہت سے سنت، سادھو اور صوفی نروان حاصل کرنے کے بعد بقیہ زندگی کسی جنگل، کسی پہاڑ، کسی غار یا کسی خانقاہ میں گزار دیتے ہیں لیکن بعض دنیا میں واپس آ جاتے ہیں تا کہ اپنے روحانیت کے سفر میں اوروں کو شریک کر سکیں اور خدمتِ خلق کر سکیں۔

نروان حاصل کرنے کے بعد سدھارتھا نے فیصلہ کیا کہ وہ دنیا میں واپس آ جائے گا۔ واپس آنے کے بعد سدھارتھا ایک عورت کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ اس کا ایک بچہ بھی ہوا اور اس نے کاروبار کرنا بھی شروع کیا۔ایک دفعہ جب اسے اپنی مادی اور روحانی زندگی میں تضاد کا احساس ہوا تو وہ پھر گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ راستے میں اسے ایک ملاح ملا جس نے اسے زندگی کے کچھ اور راز بتائے۔ سدھارتھا کو پتہ چلا کہ زندگی کے راز جاننے

کے لیے انسان کو سفر کرنا پڑتا ہے۔

روحانی سفر کے دوران سنت سادھو اور صوفی ایک نئی شخصیت تخلیق کرتے ہیں۔

جب کملا نے سدھارتھا سے پوچھا کہ تم نے روحانی ریاض سے کیا سیکھا تو وہ کہنے لگا

میں سوچ سکتا ہوں

میں روزہ رکھ سکتا ہوں

میں انتظار کر سکتا ہوں

جب کاما سوامی نے کہا 'بس یہی کچھ۔ان کا آخر کیا فائدہ ہے؟' تو سدھارتھا نے کہا جب انسان کے پاس کھانے کو کچھ نہ ہو تو روزہ رکھنا دانائی کی بات ہے۔

روحانی سفر کرنے والے وقت کے ساتھ ایک نیا رشتہ قائم کرتے ہیں۔

ہرمن ہیس نے وقت کے فلسفے کو سدھارتھا اور کشتی بان کے درمیان ایک مکالمے سے ظاہر کیا ہے۔

'کیا تم نے دریا سے یہ راز سیکھا ہے کہ وقت کا کوئی وجود نہیں' کشتی بان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے کہا 'دریا ایک ہی وقت میں ہر جگہ ہے۔

دریا پہاڑوں میں بھی ہے۔۔۔وادی میں بھی ہے۔۔۔اور سمندر میں اترتے ہوئے بھی ہے۔

وہ ہر جگہ موجود ہے اس کے لیے حال اہم ہے۔اس کا نہ کوئی ماضی ہے' نہ کوئی مستقبل'۔

عارف عبدالمتین کا شعر ہے

وقت اک بحرِ بے پایاں ہے کیسا ازل اور کیسا ابد

وقت کے ناقص پیمانے ہیں ماضی' مستقبل اور حال

جب سنت' سادھو اور صوفی معرفت حاصل کر لیتے ہیں تو وہ اپنی ذات اور کائنات سے ایک نیا رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔انہیں ہر پتھر' ہر پھول' ہر جانور اور ہر انسان میں بھگوان نظر آنے لگتا ہے۔ان کے لیے ساری دنیا مقدس بن جاتی ہے۔

ہرمن ہیس لکھتے ہیں 'سدھارتھا جھکا۔ اس نے ایک پتھر اٹھایا اور کہنے لگا یہ ایک پتھر ہے یہ ریت بن جائے گا مٹی میں مل جائے گا۔ اس مٹی سے ایک پودا بنے گا پھر جانور

ہے کا پھر انسان۔اس کائنات میں ہر چیز بدلتی رہتی ہے۔ وہ سب مایا ہے۔سب چیزیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں'

بدھا نے اپنے پیروکاروں کو بتایا کہ نروان حاصل کرنے کے لیے وہ کس طرح اس مادی دنیا میں رہ کر بھی بھوک پیاس حرص اور خواہش سے بالاتر ہو کر نروان حاصل کر سکتے ہیں۔معرفت حاصل کرنے

والا انسان کنول کے پھول کی طرح ہوتا ہے جو کیچڑ میں رہتا بھی ہے اور اس سے اوپر بھی اٹھ جاتا ہے۔

بہت سے سنت سادھو اور صوفی ساری عمر گمنامی اور خاموشی کی زندگی گزارتے رہے۔ مرنے کے بعد اور لوگوں کو ان کی عظمت کا اندازہ ہوا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے خاموشی سے انسانی شعور کے ارتقا کے سفر میں انسانیت کی رہنمائی کی اور انسانوں کو بہتر انسان بننے کی تحریک دی۔ ان کی شخصیت میں سادگی بھی تھی' حلیمی بھی اور منکسرالمزاجی بھی۔انہوں نے مختلف مذاہب اور قوموں کے لوگوں میں پل تعمیر کیے تا کہ وہ محبت' پیار' آشتی سے اپنی زندگی گزار سکیں اور جانیں کہ وہ ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور اس خاندان کا نام انسانیت ہے۔مرنے کے بعد بھی ان کی دانائی ان کے شاگردوں اور پیروکاروں کے لیے مشعلِ راہ بنتی ہے۔وہ قبروں میں نہیں انسانوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔

ہرمین ہیس کا ناول 'سدھارتھا' روحانی سفر کا ایک استعارہ ہے جس میں روحانی سفر کی نفسیات کو بہت احسن طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

O

سوہن قادری کا سفر۔۔جمالیات سے روحانیات تک

تعارف:

سوہن قادری ایک ایسے دانشور تھے جو ساری دنیا میں جمالیات اور روحانیات پر لیکچر دیتے تھے۔ وہ ایک کامیاب فنکار تھے۔ ان کی ہر اک پینٹنگ ہزاروں ڈالر میں بکتی تھی۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے اور کئی ممالک کے شہری تھے۔

سوہن قادری سے میری پہلی ملاقات ڈنمارک میں ہوئی جب میں اپنے شاعر اور جرنلسٹ دوست نصر ملک سے ملنے گیا۔ نصر ملک نے میرے لیے ایک سیمینار کا اہتمام کیا جس میں سوہن قادری بھی اپنا درویشانہ چوغہ پہنے تشریف لائے۔ پہلی ملاقات کے بعد وہ جب بھی کینیڈا تشریف لاتے تو مجھے فون کرتے اور میں انہیں 'حویلی' رستورانٹ لے کر جاتا جہاں وہ بڑے شوق سے مکئی کی روٹی اور ساگ کھاتے۔ ایک دفعہ جب ان سے ٹورانٹو میں ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے ایک انٹرویو لینے کی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے بڑی فراخ دلی سے 'ہاں' کہہ دی۔ سوہن قادری کی وفات کے بعد ان کا انٹرویو اور بھی یادگار ہو گیا۔ ایک سنت' سادھو اور درویش کی نفسیات سمجھنے کے لیے یہ انٹرویو بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اب میں آپ کی خدمت میں ان کا انٹرویو پیش کرتا ہوں۔

انٹرویو

خالد سہیل: میں اپنا انٹرویو آپکے بچپن سے شروع کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ

آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے اور آپ کے بچپن کا ماحول کیسا تھا؟

سوہن قادری: مجھے اپنی تاریخِ پیدائش کا پتہ نہیں ہے سن ۱۹۳۰ء کے اوائل کی بات ہے جب میں پنجاب کے ایک گاؤں کپورتھلہ میں پیدا ہوا۔ میں اپنے گاؤں کا پہلا لڑکا تھا جس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ وہ گاؤں جی ٹی روڈ G T Road کے پاس تھا۔ میرے دادا شاعر تھے لیکن وہ اپنے اشعار اوروں کو نہیں سناتے تھے۔ وہ ساری عمر سفر کرتے رہے۔ انہوں نے اس دور میں کینیڈا، امریکہ اور فرانس کا سفر کیا۔ ان کے دو بھائی گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے اور سادھوMonk بن گئے تھے۔ میں جب پانچویں جماعت کا طالب علم تھا تو میرے دادا کا انتقال ہوا تھا۔

سہیل: آپ کی اپنے والد کے بارے میں کیا یادداشتیں ہیں؟

سوہن: وہ ایک دانا انسان تھے لیکن خاموش طبع تھے۔ وہ ان پڑھ تھے لیکن بہت مالدار تھے۔ ان کی کافی جائداد تھی۔ وہ کبھی سکول نہ گئے تھے۔ میری والدہ بھی ان پڑھ تھیں۔

سہیل: بچپن میں آپ اپنی والدہ کے زیادہ قریب تھے یا والد کے؟

سوہن: میں اپنی والدہ کی طرح اپنے والد سے محبت کرتا تھا۔ وہ بہت نرم خو تھے۔ وہ خاموش طبع تھے۔ وہ 'ہاں' نہیں کہتے تھے لیکن 'نہ' بھی نہیں کہتے تھے۔ وہ امن پسند تھے۔ میری والدہ قدرے سخت مزاج تھیں۔ میں ان سے ڈرتا رہتا تھا۔

سہیل: کیا آپ کے بہن بھائی بھی ہیں؟

سوہن: میری ایک چھوٹی بہن ہیں۔

سہیل: نوجوانی میں آپ کی شخصیت کیسی تھی؟

سوہن: میں خاموش باغی تھا۔ میں اپنے جذبات کا زیادہ اظہار نہیں کرتا تھا۔ مجھے ڈراما زیادہ پسند نہ تھا۔ میں خاموشی سے وہ سب کچھ کرتا تھا جو مجھے کرنا ہوتا تھا۔

دس برس کی عمر میں مجھے ایک سادھو ملے میں ان کا شاگرد ہو گیا۔ میں نے ان سے ملنے کے لیے مندر جانا شروع کر دیا۔ وہ ایک ماہر موسیقار تھے لیکن لوگ ان کے فن سے ناواقف تھے۔ میں نے ان سے طبلہ بجانا سیکھنا شروع کیا۔

لیکن طبلہ بجانا ان سے ملنے کا بہانا تھا۔

سہیل: کیا آپ کے والدین مذہبی تھے؟

سوہن: میرے والد بالکل مذہبی نہ تھے۔ میری والدہ ہندوازم اور سکھ ازم دونوں سے متاثر تھیں۔ انہیں ہندو دھرم کی دیویاں بہت پسند تھیں۔

سہیل: اپنی سکول کی تعلیم کے بارے میں کچھ بتائیں؟

سوہن: میں نے درخت کے نیچے بیٹھ کر لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ ہمارے گاؤں میں ایک استاد تھا جس نے مجھے راکھ اور ریت پر ا۔ب۔لکھنا سکھایا۔ ہمارے گھر سے سکول ایک کلومیٹر دور تھا۔ میں پیدل سکول جایا کرتا تھا۔ میں نے میٹرک ۱۹۴۹ء میں پاس کیا۔ میں نے میٹرک پاس کیا تو والد نے کہا مزید تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں۔

سہیل: نوجوانی میں آپ کے کیا خواب تھے؟

سوہن: میں ایک سادھو Monk بنا چاہتا تھا۔میں نوجوانی میں گھر چھوڑ کر کئی دن تک چلتا رہا اور تبت کے جنگلوں میں پہنچ گیا تھا۔ میں وہاں تین مہینے رہا۔میری والدہ نے کچھ لوگ بھیجے جنہوں نے مجھے تلاش کر لیا اور گھر واپس لے آئے۔ مجھے گھر سے بھاگنے کی سزا ملی۔میرے استاد بھی مجھے واپس لانا چاہتے تھے۔میری والدہ کی خواہش تھی کہ میری شادی ہو جائے لیکن میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

سہیل: آپ نے ہائی سکول کی تعلیم کے بعد کیا فیصلہ کیا؟

سوہن: میں نے فوٹوگرافی کی، فلم انڈسٹری میں کام کیا اور اپنا سٹوڈیو بنایا۔

سہیل: آپ کو فوٹوگرافر بننے کا شوق کیسے پیدا ہوا؟

سوہن: میں ایک زمانے میں صوفی احمد شاہ قادری کے مزار پر جایا کرتا تھا۔وہاں مجھے کچھ کیلنڈر نظر آئے تھے۔میں ان کی تصویروں سے مسحور ہوتا تھا۔میری والدہ کو کیلنڈر پسند تھے جن پر بدھا اور گرونانک کی تصویریں بنی ہوتی تھیں۔ مجھے وہ عکس بہت بھاتے تھے۔ایک زمانے میں میں نے تصویریں بنانا اور فلم کے بینروں کے لیے پینٹ کرنا سیکھا۔اس کے بعد مجھے ہندو مندروں کے عکس نظر

آئے۔ اس وقت مجھے فن کا بالکل پتہ نہ تھا۔ میں صرف اپنے شوق سے وہ سب کام کرتا تھا۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ ایک آرٹ اکیڈمی ہے جہاں فن سیکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے شملہ آرٹ اکیڈمی میں داخلہ لے لیا۔

سہیل؛ شملہ کا تجربہ کیسا رہا؟

سوہن: وہاں کا موسم بہت سہانا تھا۔ مجھے گرم موسم پسند نہیں۔ شملہ میں سردی تھی جو مجھے پسند تھی۔ میں شانتی نکیتن یا کسی اور یونیورسٹی میں بھی جا سکتا تھا لیکن میں نے شملہ کی یونیورسٹی کا انتخاب کیا۔ اس یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر میں لاہور کے فنونِ لطیفہ کے میوسکول Mao School of Art میں آیا۔ اس وقت تک مجھے اندازہ نہ تھا کہ میں خود بھی ایک فنکار بن سکتا ہوں۔

اس دوران مجھے ایک عورت سے عشق ہو گیا اور ایک بچہ بھی پیدا ہوا۔ مجھے گردے کی بیماری بھی ہوئی۔ آپریشن بھی ہوا اور میرا ایک گردہ نکال دیا گیا۔ یہ سب ایک سال میں ہوا۔

سہیل: آپ کو کب پتہ چلا کہ آپ کے اندر ایک فنکار چھپا بیٹھا ہے؟

سوہن: یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔ میں دہلی کے آرٹ ایزیبیشن Art Exhibition میں جایا کرتا تھا اور پھر اپنے گاؤں واپس آ کر سکول میں پڑھایا کرتا تھا۔ دولت کمانے کے لیے نہیں اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے۔ میں ایک مالدار کسان کا بیٹا تھا۔ میرے لیے دولت کوئی مسئلہ نہ تھا۔ میں فارغ وقت میں ڈرائنگ کرتا تھا اور ہر سال شملہ جایا کرتا تھا۔ میں نے آرٹ کالج میں تین سال پڑھایا۔

انہی دنوں ہمارے کالج میں ایک دانشور ڈاکٹر ملک راج آنند لیکچر دینے آئے۔ انہوں نے میری پینٹنگز دیکھیں اور پرنسپل سے پوچھا 'یہ کس نے بنائی ہیں؟' پرنسپل نے کہا 'سوہن قادری نے'۔ وہ مجھ سے ملے اور مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنی پوری توجہ اپنی پینٹنگز پر مرکوز کروں۔ وہ ایک دفعہ مجھ سے ملنے میرے گاؤں بھی آئے۔ انہوں نے مجھے ایک فنکار کے طور پر دریافت کیا۔ ان کے مشورے کی وجہ سے میں نے نوکری چھوڑ دی اور اپنے فن پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی۔ میں

نے اپنا پہلا شو چندی گڑھ کی یونیورسٹی لائبریری میں ۱۹۶۲ء میں دیا۔ وہ شو بہت کامیاب تھا۔ اس کے بعد میں نے سارے ہندوستان اور ساری دنیا میں اپنی پینٹنگز کے کامیاب شو کیے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ فنکار ہونے کے ناطے مجھے کبھی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لوگوں نے ہمیشہ مجھے چاہا اور سراہا اور میری عزت کی۔ میں یورپ گیا تو وہاں بھی لوگوں نے مجھے عزت دی۔ میں بہت مشہور تو نہ ہوا لیکن میں نے باقی فنکاروں کی طرح کبھی فاقہ کشی بھی نہ کی۔ میں خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے میں نے وہ سب اپنے فن کو دے دیا۔ میں تنہائی پسند ہوں۔ میں نے فن کے بارے میں کبھی مباحث میں حصہ نہیں لیا۔ مجھے اپنی پینٹنگز بیچنے کا بھی شوق نہ تھا کیونکہ مجھے دولت کی ضرورت نہ تھی۔

سہیل: آپ نے ہندوستان کب چھوڑا؟

سوہن: ۱۹۶۶ء میں ۔میں پہلے نائجیریا گیا۔ مجھے کسی نے شادی کی دعوت کا کارڈ بھیجا تا کہ میں ویزا لے کر نائجیریا جا سکوں۔ میں وہاں ایک سال رہا۔ نائجیریا جانا میری زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ تھا۔ ہمارے گاؤں کے قریب ایک شہر جالندھر تھا جو ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کا مرکز تھا۔ وہاں سب فنکار کافی ہاؤسوں میں جمع ہوا کرتے تھے۔ مجھے ایک دن ملک راج آنند کا خط آیا کہ مجھے ہندوستان چھوڑ کر یورپ جانا چاہیے اور اپنے فن پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ اگر مجھے لڑنا سیکھنا ہے تو مجھے وہاں جانا چاہیے جہاں جنگ ہو رہی ہو۔ انہوں نے کہا میرے گاؤں میں کوئی جنگ نہیں لڑی جا رہی۔ اگر مجھے فنکار بننا ہے تو مجھے اپنا گاؤں چھوڑنا پڑے گا۔ ہندوستان چھوڑنے کے خیال کا بیج انہوں نے میرے ذہن میں بویا۔

چنانچہ میں پہلے نائجیریا گیا۔ میں ہوائی جہاز سے نہ جا سکتا تھا چنانچہ میں سمندری جہاز سے گیا۔ ہندوستان سے نائجیریا جانے میں آٹھ دن لگے۔ میرے پاس اس وقت پیسے نہ تھے۔ ہندوستانی حکومت نے مجھے ساڑھے چھ ڈالر دیے تا کہ میں نائجیریا میں شادی میں شرکت کر سکوں۔ وہ شادی جو کبھی

نہیں ہوئی۔ میرے ساتھ ایک غریب شاعر دوست بھی سفر کر رہا تھا۔ اسے شرا
ب پینے کا شوق تھا چنانچہ اس نے میرے آدھے ڈالر کی شراب پی لی۔
میرے شاعر دوست کا ایک دوست نائجیریا میں تھا۔ اس نے ہمارا خیال رکھا
لیکن جس دن ہم نائجیریا پہنچے وہ ہمیں لینے نہ آ سکا کیونکہ اس کا
اپنڈکسAppendix کا آپریشن ہونا تھا اور وہ ہسپتال میں داخل تھا۔

چنانچہ جب ہم نائجیریا پہنچے تو ہم نے ساری رات جہاز میں گزاری اور کیلے
کھاتے رہے۔ میرے پاس بڑے بڑے صندوق تھے جن میں میری پینٹنگز
تھیں۔ میرے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ کلی کو دیتا تا کہ وہ میرے صندوق جہاز
سے اتارے۔ اس رات ایک مالدار باپ کا بیٹا چند سکوں کا محتاج تھا۔ پھر ایک
اجنبی دوست آیا اور اس نے ہمیں اس آزمائش سے نکالا۔ نائجیریا میں پندرہ
دن رہنے کے بعد میں نے ایک کار خریدی۔ نائجیریا کی جن گیلریوں نے میری
پینٹنگز کی نمائش کی ان میں امریکی گیلری بھی شامل تھی۔ ان دنوں میرے پاس
صرف دومہینوں کا ویزا تھا۔ چنانچہ مجھے ان دومہینوں میں بہت سارا کام کرنا
پڑا۔ میرے شو بہت کامیاب ہوئے اور وہ کامیابی وقت کے ساتھ بڑھتی ہی چلی
گئی۔ نائجیریا میں رہنا ایک رنگین تجربہ تھا۔ نیلا آسمان‘ چاندی کی طرح ریت
اور انسانوں کی گہری رنگ کی جلدیں۔ چاروں اطراف شوخ رنگ تھے۔ مجھے
نائجیریا رہنے کا بہت لطف آیا۔

سہیل: آپ نے فوٹو گرافی سے تجریدی آرٹ کا سفر کیسے طے کیا؟

سوہن: یہ ایک تکنیکی سوال ہے۔ ہر فنکار کو اپنا میڈیم تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اسے اپنا فن
اپنے انداز سے پیش کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے اسے کچھ رسکrisk لینا پڑتا
ہے۔ اس راہ میں مجھے کچھ قربانیاں بھی دینی پڑیں لیکن میں نے ان کی کبھی پرواہ
نہ کی۔ میرا ایمان ہے کہ نیا راستہ تلاش کرنے کے لیے ہمیں اندھیرے میں چند
قدم چلنا پڑتا ہے۔ جب میں نائجیریا سے زیورکZurich گیا تو میں نے اپنی
راہ اور اپنا سٹائل تلاش کر لیے تھے۔ اس کے بعد میں آگے بڑھتا گیا اور فن
کے راز جانتا گیا۔

آپ ایک ماہرِ نفسیات ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ شخصیت کی نشوونما لوگوں کو خوفزدہ کر سکتی ہے لیکن میں نے اس خوف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ فنکار کو اپنے فن کے ارتقا کے لیے اپنے پچھلے فن کو رد کرنا پڑتا ہے۔ جب انسان اپنے کسی پرانے سچ کو خیرباد کہتا ہے تو اس کے بعد ایک خلا آتا ہے۔ ایک تاریک دور آتا ہے۔ اس کے بعد اس پر نیا سچ منکشف ہوتا ہے۔ میں پہلے کینوس پر پینٹ کرتا تھا اب میں کاغذ پر کرتا ہوں۔ کاغذ کی پینٹنگ کم بکتی ہیں۔ لیکن مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ گیلری مجھ سے کینوس مانگتی ہے میں کاغذ دیتا ہوں۔ میں بار بار اپنے مستقبل کے لیے اپنے ماضی کو رد کرتا ہوں۔ یہ تخلیقی سفر کا حصہ ہے۔ اور میں اس راستے پر طویل عرصے سے سفر کر رہا ہوں۔

سہیل: ایک دفعہ آپ نے کہا تھا کہ آپ اپنے تخلیقی موڈ میں ہفتوں رہتے ہیں اور اپنے کام میں کھو جاتے ہیں۔ کیا آپ اس تخلیقی موڈ کے بارے میں بتائیں گے؟

سوہن: میں اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے تخلیقی کام میں کھو نہیں جاتا۔ میں اس عمل کے دوران باخبر ہوتا ہوں اور وہ باخبر ہونا مجھے اپنے کام کو مکمل کرنے میں میری مدد کرتا ہے۔

فن کے بارے میں گفتگو کرنا مشکل کام ہے لیکن انسان گفتگو کرنے والا جانور ہے اسی لیے سب انسان ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ گفتگو کرنا دوسرے درجے کا تجربہ ہے۔ جب آپ کسی پینٹنگ کو دیکھ رہے ہوتے ہیں تو آپ صرف دیکھ رہے ہوتے ہیں اور کچھ محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت آپ خاموش ہوتے ہیں۔ دیکھنا ایک معصوم عمل ہے۔ جب آپ دیکھ رہے ہوتے ہیں اور محسوس کر رہے ہوتے ہیں تو وہ تجربہ دماغ کے کسی اور حصے میں جا رہا ہوتا ہے۔ لیکن جب آپ گفتگو کر رہے ہوتے ہیں تو آپ دماغ کو کوئی اور حصہ استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ دیکھنے کا عمل لمحۂ موجود میں ہوتا ہے۔ نہ آپ آئندہ کل دیکھ سکتے ہیں نہ گزشتہ کل۔ لیکن آپ آئندہ کل اور گزشتہ کل کے بارے میں سوچ ضرور سکتے ہیں۔ اس لیے جب میں پینٹنگ کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں تو میں ان کے بارے میں سوچ رہا ہوں انہیں دیکھ نہیں رہا۔

میرا تخلیقی عمل ایک لہراتے ہوئے عکسfloating image سے شروع ہوتا ہے۔ میں اس عکس کو کینوس پر منتقل کرنا چاہتا ہوں۔اس عمل میں سوچنے یا تجزیہ کرنے کا عمل شامل نہیں ہوتا۔اور جب میں اس image کو کینوس پر منتقل کر لیتا ہوں تو کہتا ہوں 'واہ'۔ جب آپ کینوس پر میری پینٹنگ دیکھتے ہیں تو آپ کو یوں لگتا ہے جیسے وہ تیر رہی ہوں۔ تیرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نامکمل ہیں۔ جب میں ایک عکس کو کینوس پر منتقل کر لیتا ہوں تو پھر میں دوسرے عکس اور دوسری پینٹنگ کا انتظار کرتا ہوں۔بعض دفعہ مجھے دوسری پینٹنگ کا مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ہم اس وقت نومبر کے مہینے میں ہیں ۔میں نے پچھلی پینٹنگ جولائی کے مہینے میں بنائی تھی۔ میں زبردستی پینٹنگ نہیں بناتا۔ میں تخلیقی لمحوں کا انتظار کرتا ہوں۔

سہیل: جب آپ نئی پینٹنگ کے لیے تیار ہو رہے ہوتے ہیں تو آپ کو سب سے پہلے کیا محسوس ہوتا ہے؟

سوہن: مجھے یہ خواہش ہوتی ہے کہ مجھے اپنے سٹوڈیو جانا چاہیے۔میں ایک نیا برش خریدتا ہوں۔نئے رنگ خریدتا ہوں۔ اگرچہ سٹوڈیو میں میرے پاس برش بھی ہوتے ہیں اور رنگ بھی۔ نیا برش اور نیا رنگ لے کر سٹوڈیو جاتا ہوں۔ پینٹنگ بنانے کے لیے مجھے یکسوئی اور بہت سا وقت چاہیے تاکہ اس تخلیقی عمل کو دوران کوئی کام یا شخص مجھے پریشان مجھےdisturb نہ کرے۔آج دو نومبر ہے اور مجھے نو نومبر کو پیرس جانا ہے اس لیے اس دوران میں یکسوئی سے پینٹنگ کا کام نہیں کر سکتا۔ میں پینٹنگ بنانی شروع کرتا ہوں تو اس وقت تک بناتا رہتا ہوں جب تک کہ وہ تخلیقی لہر ختم نہیں ہو جاتی۔وہ تخلیقی موڈ ختم نہیں ہو جاتا۔

سہیل: آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ آپ کا کینوس سے رشتہ مقدس ہے۔ اور بعض فنکار کینوس پر اپنا کوڑا کرکٹ ڈال دیتے ہیں۔

سوہن: میرے نزدیک پینٹنگ بنانا یا کوئی اور تخلیقی عمل بچے کو پیدا کرنے کے عمل کی طرح ہے۔میں نے ناروے میں ایک لیکچر کے دوران کہا تھا کہ وہ مجسمے جو مندروں میں ہوتے ہیں ان مجسمون سے مختلف ہیں جو محلوں میں ہوتے

ہیں۔مندروں کے مجسموں میں ایک عقیدت کا عنصر شامل ہوتا ہے۔میرے نزدیک فن عبادت کی طرح ہے۔بعض فنکار معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں اور بعض اصلاح کرتے ہوئے اسے اور بگاڑ دیتے ہیں۔

میں نے لیکچر کے دوران کہا کہ میرا کینوس سے رشتہ خاموشی کا رشتہ ہے۔میں خاموشی سے اپنے ذہن کا عکس کینوس پر منتقل کرتا ہوں۔یہ پرامن رشتہ ہے۔بعض فنکاروں کے اندر بہت سی جارحیت ہوتی ہے اور وہ اس جارحیت کو کینوس پر منتقل کرتے ہیں۔جو دیکھنے والوں کو متاثر کرتی ہے۔

سہیل: اگر سب فنکار آپ کے اس اصول پر عمل کرنے لگیں تو وہ پرامن اور خاموش تو ہو جائیں لیکن فن تخلیق کرنا بند کر دیں۔

سوہن: میں آپ کو اپنا موقف ایک اور طریقے سے سمجھاتا ہوں۔عیسیٰ نے کہا تھا اپنے ہمسائے سے محبت کرو جیسے تم اپنے آپ سے محبت کرتے ہو۔پھر کہا کہ اپنے دشمن سے اسی طرح محبت کرو جیسے تم اپنے آپ سے محبت کرتے ہو۔ جب کسی نے سینٹ اگسٹین Saint Augustein سے پوچھا کہ عیسیٰ کے فرمودات کا کیا مطلب ہے تو انہوں نے کہا کہ تمہارا ہمسایہ ہی تمہارا دشمن ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عیسیٰ کے کہنے سے سب مسائل حل ہو گئے۔کیا سب لوگ اپنے ہمسائے سے محبت کرتے ہیں۔نہیں ایسا نہیں ہے۔ہمارے پاس صدیوں سے اچھے فرمودات ہیں لیکن ان کا کیا فائدہ؟ کیا لوگوں نے ان پر عمل کیا؟ اگر نہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟

عیسیٰ کے مقابلے میں بدھا کا بھی ایک فرمان ہے۔ بدھا نے کہا 'اپنے دشمن سے دشمنی مت کرو' انہوں نے یہ نہیں کہا 'اپنے دشمن سے محبت کرو'۔انہوں نے کہا اس سے دشمنی مت کرو۔بدھا جانتے تھے کہ جب آپ کسی سے محبت کرتے ہیں تو آپ اس سے ایک خاص تعلق قائم کرتے ہیں اور اگر اس تعلق میں مسائل پیدا ہوں تو محبت نفرت میں بدل سکتی ہے۔ جب آپ کسی سے توقعات رکھتے ہیں تو جلد یا بدیر اس سے مایوس ہو سکتے ہیں۔اگر آپ توقعات نہیں رکھتے تو مایوس بھی نہیں ہوتے۔غالب نے کہا تھا

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

میں محبت کے خلاف نہیں ہوں میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جب ہم محبت کرتے ہیں تو ہمیں محتاط رہنا چاہیے کیونکہ وہ محبت کسی بھی وقت نفرت میں بدل سکتی ہے۔

بدھا نے کہا دشمنی مت کرو۔ جب آپ دشمنی نہیں کرتے تو آپ کا ذہن پرسکون رہتا ہے۔ بدھا نے یہ بات ۲۵۰۰ سال پہلے کہی تھی۔ اس قول کو آج تک لوگ سمجھ نہیں پائے۔

سہیل: لیکن خاموشی سے بے عملی بھی تو پیدا ہو سکتی ہے۔ بعض لوگ خاموش رہتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے۔ وہ ست الوجود ہو جاتے ہیں۔

سوہن: خاموشی سے محبت پیدا ہو سکتی ہے نفرت پیدا نہیں ہو سکتی۔ جب ہم الفاظ استعمال کرتے ہیں تو ان سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اور غلط فہمی سے جنگ کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ ایک صحتمند مکالمے میں لوگ ایک ہی مسئلے کو مختلف انداز سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں یہ ایک احسن کام ہے۔ الفاظ کو آگے پیچھے کر کے دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش اور قائل کرنے کی کوشش ایک سیاستدان کا کام ہے فنکار کا کام نہیں ہے۔

سہیل: فنکار اپنے فن کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ سادھو خاموش رہنا چاہتا ہے۔ آپ ایک فنکار بھی ہیں اور ایک سادھو بھی۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

سوہن: ایک انسان کی شخصیت کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ لازمی نہیں کہ ان میں تضاد ہی ہو۔ اچھائی برائی کا تضاد انسانی ذہن کا پیدا کردہ ہے۔ میں زندگی کا مشاہدہ کرتا ہوں اس پر فتویٰ نہیں لگاتا۔ میں فنکار بھی ہوں سادھو بھی۔ لوگ مجھے قبول کر سکتے ہیں وہ مجھے رد کر سکتے ہیں۔ یہ ان کا عمل ہے۔

مہابیر نے کہا تھا انسان ہر لمحہ حالتِ تغیر میں ہے۔ کائنات بھی عالمِ تغیر میں ہے۔ بھگوان بھی عالمِ تغیر میں ہے۔ جب کوئی چیز عالمِ تغیر میں ہو تو اس کے بارے میں آپ حتمی رائے نہیں دے سکتے۔ ہم سب بدل رہے ہیں۔ کچھ سے

کچھ بن رہے ہیں۔ ہم سب ارتقا کے سفر میں ہیں۔

سہیل: آپ کا بدھا اور مہابیر کی تعلیمات سے کیسے تعارف ہوا؟

سوہن: بچپن میں میرے استاد نے میرا ان کی تعلیمات سے تعارف کروایا۔لیکن وہ تعلیمات ترجمہ تھیں۔ میں نے بدھا کی زبان پالی سیکھی تا کہ ترجمہ پڑھنے کی بجائے اصل پڑھ سکوں اور سمجھ سکوں۔

سہیل: اپنے استاد کے بارے میں کچھ اور بتائیں۔

سوہن: میں اپنے استاد سے طبلہ سیکھنے جاتا تھا۔لیکن طبلہ صرف بہانہ تھا۔ مجھے طبلہ سیکھنے سے زیادہ اپنے استاد کے ساتھ وقت گزارنے کی خواہش تھی۔میرے استاد ایک سنیاسی تھے۔ وہ موسیقار بھی تھے۔وہ صبح صبح گاؤں میں آتے تھے۔ لوگوں کو دعائیں دیتے تھے اور بھیک مانگتے تھے۔لوگوں سے آٹا اور چاول اورسوکھا کھانا لیتے تھے۔ پکا ہوا کھانا نہیں لیتے تھے۔

بدھا اپنے پیروکاروں کو سنیاسی کہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ بھیک مانگیں۔وہ ہندو روایت کو ختم کرنا چاہتے تھے جو اپنے سادھوؤں کو سوامی(استاد) کہتے ہیں۔ بدھا اپنے پیروکاروں کو حلیمی، عاجزی اور انکساری سکھانا چاہتے تھے۔

جب میں اپنے استاد کو بھیک مانگتے دیکھتا تھا تو مجھے بہت دکھ ہوتا تھا۔آخر ایک دن میں اپنے بائیکل پر چاول کی بوری رکھ کر استاد کے پاس پہنچ گیا اور کہا' آپ کو جب بھی چاول یا آٹا چاہیے ہو مجھے بتا دیا کریں میں آپ کے لیے لا دیا کروں گا۔ آپ بھیک مانگنے نہ آیا کریں'۔انہوں نے کہا میں بھیک مانگنے آٹے یا چاول لینے کے لیے نہیں آتا۔میں اپنے نفس کو مارنے آتا ہوں۔بھیک مانگنے سے عاجزی اور انکساری پیدا ہوتی ہے۔جو لوگ علم حاصل کر لیتے ہیں وہ مغرور ومتکبر ہو جاتے ہیں۔ درویشی حلیمی سکھاتی ہے۔

سہیل: عیسیٰ کے پیروکار خیرات دیتے ہیں بدھا کے پیروکار خیرات لیتے ہیں ان دونوں روایتوں میں اتنا فرق کیوں ہے؟

سوہن: عیسیٰ نے کہا' اپنے ہمسائے سے محبت کرو۔اپنے دشمن سے محبت کرو' بدھا نے کہا' دشمن سے دشمنی نہ کرو'۔جب ہم خیرات دیتے ہیں تو دوسروں سے رشتہ قائم

کرتے ہیں۔ بدھا رشتہ قائم کرنے سے کتراتے تھے۔ بدھا بے نیازی سکھاتے تھے۔ بدھا کہتے تھے نہ محبت کرو نہ نفرت کرو۔ رشتوں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ اسی میں سکون ہے۔

سہیل: مغرب میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر آپ بے نیاز ہیں تو آپ بے حس ہیں۔ آپ ہمدرد انسان نہیں ہیں۔

سوہن: بدھا نے فرمایا کہ جب آپ کسی کی خدمت کر رہے ہوتے ہیں تو آپ اپنے ساتھ زیادتی کر رہے ہوتے ہیں۔ میں اپنے موقف کی وضاحت کے لیے چار طرح کے ذہنوں کی بات کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی قسم :Taker's Mind ایسا انسان ہر وقت لیتا رہتا ہے دیتا نہیں۔

دوسری قسم: Giver's Mind ایسا انسان ہر وقت دیتا رہتا ہے لیتا نہیں لیکن دینے کے لیے لینا ضروری ہے۔اس لیے دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔

تیسری قسم: Indifferent Mind ایسا انسان ہر چیز سے بے نیاز ہوتا ہے۔

چوتھی قسم: Natural Mind ایسا انسان فطری ہوتا ہے جو کبھی دیتا ہے کبھی لیتا ہے اور کبھی بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ مختلف حالات کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔

میں بدھا کے پیروکاروں اور عیسیٰ کے پیروکاروں کے درمیان فرق کو ایک کہاوت کے ذریعے سمجھانا چاہتا ہوں۔

ایک انسان کنویں میں گر گیا۔ ایک بدھا کا پیروکار ادھر سے گزرا۔ اس نے کنویں میں گرے ہوئے انسان کو دیکھا اور سوچا 'اگر میں نے اسے ایک کنویں سے نکالا تو وہ دوسرے کنویں میں گر جائے گا۔ اسے اس بات پر غور و تدبر کرنا چاہیے کہ وہ کنویں میں کیوں گرا ہے'۔

پھر ایک عیسیٰ کا پیروکار ادھر سے گزرا۔اس نے کنویں میں گرے انسان کو دیکھا تو اس کی مدد کرنے کے لیے لوگوں کے پاس گیا اور ان سے ایک رسی مانگی۔ لوگوں نے اسے رسی دے دی۔ عیسیٰ کے پیروکار نے کنویں میں جب رسی ڈال کر اس انسان کو نکالا تو سب لوگوں نے اس کی تعریف کی۔اس واقعہ کے بعد عیسیٰ کا پیروکار ہر وقت اپنے ساتھ رسی رکھتا ہے اور کنویں میں گرے ہوئے

انسانوں کی تلاش کرتا رہتا ہے تا کہ رسی ڈال کر ان کو نکال سکے اور اگر کنویں میں کسی انسان کو نہیں دیکھتا تو مایوس ہوجاتا ہے۔اب وہ رسی اس کے گلے کا ہار بن گئی ہے۔یہ خیرات دینے والوں کا المیہ ہے۔ وہ ہر وقت لوگوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں بعض دفعہ اصلاح کرتے کرتے وہ اسے اور خراب کر دیتے ہیں۔

سہیل: آپ نے ساری عمر جمالیات اور روحانیات پر لیکچر دیے ہیں۔ مجھے اپنا فلسفہِ حیات مختصر الفاظ میں بتائیں۔

سوہن: جمالیات خوبصورتی کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔ چیزوں کی خوبصورتی۔ خاموشی کی خوبصورتی۔آہ کی خوبصورتی۔ کراہ کی خوبصورتی۔جب ایک بچہ مسکراتا ہے تو وہ کچھ کہہ رہا ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک فنکار ہے۔ انسان جمالیات سے زندگی کو سمجھنے اور اس سے محظوظ ہونا سیکھتا ہے۔

جب انسان غاروں میں رہتے تھے تو انہوں نے کلہاڑی بنائی تا کہ درخت کاٹ سکیں ہرن کو ذبح کر سکیں۔انہوں نے کلہاڑی کو تیز کیا تا کہ انہیں دانتوں کا استعمال نہ کرنا پڑے۔ جب وہ کھانا کھا چکے اور ان کی بنیادی ضرورت پوری ہو گئی۔تو انہوں نے کلہاڑی کے پیچھے ایک پھول بنایا۔کھانے نے ان کی جسمانی بھوک کو مٹایا پھول نے ان کی جمالیاتی بھوک کو مٹایا۔ پھول کا جسمانی بھوک سے کوئی تعلق نہ تھا۔صدیوں کے سفر سے اس کلہاڑی نے missiles کا اور اس کے پھول نے تاج محل کی صورت اختیار کر لی ہے۔

کلہاڑی کی تیز دھار اور پھول کی نزاکت ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں اور ارتقا کا سفر طے کرتے رہے ہیں۔ہر عہد اور ہر معاشرے میں حسن کا معیار مختلف رہا ہے۔ غار میں رہنے والے انسانوں کی جمالیات میں معصومیت تھی۔ وہ صرف محظوظ ہونا چاہتے تھے۔ ان کے پاس نہ تو نقاد تھے اور نہ ہی تنقید کے سنجیدہ اصول۔ ان کا انداز روحانی تھا۔لیکن اس روحانیت کو مذہب نے تباہ کردیا ہے۔ مذہب جبر اور طاقت کا سرچشمہ ہے۔ مذہبی انسان دوسرے انسانوں پر اپنی طاقت کا اظہار چاہتا ہے۔آپ ایک ماہرِ نفسیات ہیں آپ جانتے ہیں دوسروں

پو ظلم وہی کرتا ہے جو اندر سے کمزور محسوس کرتا ہو۔ بدھا نے فرمایا زیادہ نیک بننے کی کوشش نہ کرو۔ مہابیر نے فرمایا زندگی کے فطری بہاؤ کو خراب نہ کرو۔ فطری انداز سے زندگی گزارو یہی روحانیت ہے۔

جب سوال کرنے والا سوال میں مرتا ہے تو جواب رقص کرتا ہے۔
ہمالہ پہاڑ انسان کی آنکھ کے ایک ذرے کے پیچھے چھپ جاتا ہے

سوہن قادری

جعلی پیر

ہر قوم اور تاریخ کے ہر دور میں جہاں ایسے سنت ' سادھو اور صوفی ہوتے ہیں جو نروان حاصل کر کے خدمتِ خلق کرتے ہیں وہیں کچھ ایسے جعلی پیر بھی ہوتے ہیں جو سادہ لوح لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ وہ عوام کا استحصال کرتے ہیں۔ ایسے جعلی پیروں میں سے اکثر کی کچھ وقت گزرنے کے بعد قلعی کھل جاتی ہے اور ان کے مریدوں کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کا استحصال ہو رہا ہے۔ لیکن اس وقت تک ان کا بہت سا وقت اور پیسا ضائع ہو چکا ہوتا ہے۔

یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ ہر شہر' ہر ملک اور ہر دور میں سینکڑوں' ہزاروں' لاکھوں لوگ ان جعلی پیروں کی ہوس کا نشانہ بنتے ہیں۔ ایسے جعلی پیر مردوں کے مالی استحصال کے ساتھ ساتھ بہت سی عورتوں کا جنسی استحصال بھی کرتے ہیں۔ یہ جعلی پیر بانجھ عورتوں کو بچوں کا خواب دکھاتے ہیں اور ان کے ساتھ ہمبستری کرتے ہیں۔

جب ہم ایسے جعلی پیروں' سادھوؤں' سنتوں اور صوفیوں کو نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ایسے جعلی پیر ایک کلٹش شخصیت Cultish Personality کے مالک ہوتے ہیں۔ ایسے جعلی پیروں کی شخصیت میں ایک خاص طرح کا سحر اور جادو ہوتا ہے جو عام لوگوں کو مسحور کر دیتا ہے۔ نجانے کتنے لوگ ایسے جعلی پیروں کی باتوں پر اندھا ایمان لے آتے ہیں۔ جب ہم جعلی پیروں سنتوں سادھوؤں اور صوفیوں کی زندگی کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ڈرامے کے کئی پہلو' کئی باب اور کئی ادوار ہوتے ہیں۔

پہلا دور۔ اس دور میں جعلی پیر لوگوں کو مسحور کرتے ہیں۔ لوگ ان کی طرف مقناطیس کی طرح کھنچے چلے آتے ہیں۔ یہ جعلی پیر لوگوں کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے خاص حربے استعمال کرتے ہیں۔

دوسرا دور: جب عوام ان جعلی پیروں پر اندھا ایمان لے آتے ہیں تو وہ جعلی پیر دولت اور طاقت جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔آہستہ آہستہ ان کی شہرت بڑھتی ہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے دام میں پھنسنے لگتے ہیں۔دیکھتے ہی دیکھتے ان کا دائرۂ اختیار بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔

تیسرا دور: یہ جعلی پیر اپنے پیروکاروں کی زندگیوں کو کنٹرول کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ان کی دولت اور ان کی عورت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ جعلی پیر اپنی رائے' اپنا ایمان اور اپنا طرزِ زندگی اپنے مریدوں پر مسلط کرتے ہیں۔

چوتھا دور جب یہ جعلی پیر بہت طاقتور ہو جاتے ہیں تو ان کی طاقت کا ناجائز استعمال اور استحصال بڑھنے لگتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ زیادہ امیر اور ان کے مرید زیادہ غریب ہونے لگتے ہیں۔

پانچواں دور: یہ جعلی پیر انسانوں کے ساتھ ساتھ خدا اور مذہب کا بھی ناجائز استعمال کرتے ہیں۔وہ عوام کو بیوقوف بنانے کے لیے انہیں بتاتے ہیں کہ انہیں الہام ہوا ہے اور لوگ ان کی باتوں پر یقین لے آتے ہیں۔وہ جعلی پیر جانتے ہیں کہ ان کے پیروکار خدا اور پیغمبر کی بات نہیں جھٹلائیں گے۔بعض جعلی پیر تو اپنے مریدوں اور پیروکاروں کو کرامتیں بھی دکھاتے ہیں۔

چھٹا دور: ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ ان جعلی پیروں کی قلعی کھلنی شروع ہو جاتی ہے۔ان کے مریدوں اور پیروکاروں پر عیاں ہونے لگتا ہے کہ ان کا پیر جعلی ہے۔ ڈرامہ ہے۔فراڈ ہے۔دھوکے باز ہے۔بعض جعلی پیر قانون کی زد میں آ جاتے ہیں۔ایک دن ان کی جھوٹی عمارت دھڑام سے گر جاتی ہے۔دکھ کی بات یہ ہے کہ اس ڈرامے میں سینکڑوں' ہزاروں اور لاکھوں معصوم انسانوں کی عزت اور دولت لٹ جاتی ہے۔

بیسویں صدی میں ایسے جعلی پیروں' سنتوں' سادھوؤں اور مذہبی رہنماؤں کی چند مثالیں ڈیوڈ کریش David Koresh' مونی فرقے کے Moonies کے سنگ مینگ

مونSung Myung Moon چرچ آف سائنٹالوجی کے رون ہبرڈ Ron Hubbard اور گرو راجنیش Guru Rajnesh شامل ہیں۔ گرو راجنیش ہندوستان میں فلسفے کے استاد تھے پھر انہوں نے روحانی اور جنسی آزادی کی تحریک چلائی اور لاکھوں لوگ ان کے پیروکار اور مرید بن گئے۔ جب وہ امریکہ میں رہتے تھے تو ان کے پاس ننانوے رولز روئس Roles Royce گاڑیاں تھیں۔انہوں نے اپنا نام بھی بھگوان رکھا تھا۔

جب امریکی حکومت نے انہیں ملک بدر کیا تو وہ بے گھر ہو گئے۔ امریکہ نے ملک سے نکال دیا اور ہندوستان نے لینے سے انکار کر دیا۔وہ کافی عرصے تک ساری دنیا میں ذلیل وخوار ہوتے رہے اور پھر ۱۹۹۰ء میں فوت ہو گئے۔

ہندوستان کے شہر پونا میں ان کا آشرم ہے ۔ان کا جانشین ایک کنیڈین جج کا بیٹا سوامی مائک Mike swami ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس آشرم کی آمدنی ہر سال پچپن ملین ڈالر ہے۔

جعلی پیر، سنت سادھو اور صوفی نجانے کب سے سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں اور نجانے کب تک بناتے رہیں گے۔ نجانے کتنے لوگ جعلی پیروں پر اندھا ایمان لانے کی وجہ اپنی زندگیاں تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

مغربی ماہرِ نفسیات ۔۔ مشرقی ماہرِ روحانیات

جب میں تبت کے دالائے لامہ کی آپ بیتی کا مطالعہ کر رہا تھا تو مجھے یہ پڑھ کر حیرانی ہوئی کہ انہوں نے امریکہ کے ڈاکٹر ہربرٹ بنسن Dr Herbert Benson سے نہ صرف ملاقات کی تھی بلکہ ڈاکٹر بنسن کی دعوت کو بھی قبول کیا تھا کہ وہ ماہرینِ نفسیات کی ایک ٹیم لے کر تبت جائیں گے اور وہاں کے سادھوؤں پر تحقیق کریں گے۔ اس تحقیق سے پہلے ڈاکٹر بنسن اپنی کتاب Relaxation Response چھاپ چکے تھے جس میں Anxiety and Depression انزائٹی اور ڈیپریشن کے مریضوں کو یہ بتایا گیا تھا کہ وہ کس طرح ذہنی سکون حاصل کر سکتے ہیں۔ اس معاہدے سے مشرق کے ماہرِ روحانیات دالائے لامہ اور مغرب کے ماہرِ نفسیات ڈاکٹر بنسن سائنس اور روحانیات کے درمیان ایک پل تعمیر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

دالائے لامہ کی آپ بیتی پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ آخر دالائے لامہ نے مغرب کے سیکولر ماہرِ نفسیات کو روحانیات پر تحقیق کرنے کی اجازت کیوں دی۔ دالائے لامہ نے خود اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ان کے چند بدھسٹ بزرگوں نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا تھا۔ انہوں نے دالائے لامہ سے کہا کہ ان سادھوؤں اور سنتوں کے پاس کچھ مقدس راز ہیں۔ وہ راز اگر ان کے دلوں میں ہی رہیں تو بہتر ہے۔ اگر وہ راز مغرب کے سائنسدانوں تک پہنچ گئے تو رسوا ہوں گے۔ دالائے لامہ نے ان بزرگوں کی بات نہ مانی اور ڈاکٹر بنسن کو تبت آنے کی دعوت دے دی۔

کتاب پڑھتے ہوئے میں یہ بھی سوچتا رہا کہ کیا دالائے لامہ نے وہ دعوت

خلوص دل سے دی تھی یا ان کا کوئی درپردہ سیاسی مقصد بھی تھا کیونکہ وہ ایک روحانی پیشوا ہی نہیں ایک سیاسی لیڈر بھی ہیں جو تبت کی آزادی کے لیے کوشاں ہیں اور ہندوستان میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ کیا دالائی لامہ اس ریسرچ سے امریکی لوگوں اور حکومت کو متاثر کرنا چاہتے ہیں اور بالواسطہ چینی حکومت کو بتانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے تبت میں بدھسٹ راہبوں کی خانقاہوں Monasteries کو تباہ کر کے بہت ظلم کیا تھا۔

میں نے اپنے شک کو دور کرنے اور اپنے دل میں اٹھنے والے سوالوں کے جواب تلاش کرنے کے لیے ڈاکٹر بنسن کی کتاب Beyond the Relaxation Response پڑھی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر بنسن لکھتے ہیں کہ جب انہوں نے دالائی لامہ سے درخواست کہ وہ تبت آ کر راہبوں پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ وہ عبادت سے کیسے ریلیکس Relax ہوتے ہیں تو شروع میں دالائی لامہ نے انکار کر دیا۔ وہ کہنے لگے کہ بدھسٹ راہب ریلیکس relax ہونے کے لیے نہیں بلکہ روحانی معرفت اور نروان حاصل کرنے کے لیے مراقبہ کرتے ہیں۔ اس مراقبے کے اثرات ان کی روح پر ہوتے ہیں ان کے جسم پر نہیں۔ مغربی سائنس کا کوئی آلہ اس اثر کو ریکارڈ Record نہیں کر سکتا۔ لیکن پھر تھوڑی دیر کے توقف کے بعد کہنے لگے 'اچھا میں اجازت دے دیتا ہوں ہو سکتا ہے اس تحقیق سے ہمارے چینی ہمسائے متاثر ہوں اور ان کے دل میں چینی راہبوں کی عزت بڑھ جائے'۔

ڈاکٹر بنسن کی کتاب پڑھ کر میرے شک کو تقویت ملی کہ دالائی لامہ نے صرف انسان دوستی کی وجہ سے نہیں سیاسی مصلحت کی وجہ سے بھی ڈاکٹر بنسن کو تبت بلایا تھا۔

ڈاکٹر بنسن نے اپنی کتاب میں تفصیل سے لکھا ہے کہ جب وہ بدھسٹ راہبوں سے ملے تو انہیں

اندازہ ہوا کہ وہ Tum-mo روایت کے پیروکار تھے جو chakra energy centres and nadi energy channels پر مراقبہ کرتے تھے اور شعور کی ظاہری سطحوں سے باطنی سطحوں تک جانے کی کوشش کرتے تھے۔ ایسے مراقبے سے وہ نروان اور cosmic consciousness حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس عبادت اور مراقبے کے اثرات جاننے کے لیے سائنسدانوں نے راہبوں کی جلد' انکے منہ اور ان کی مقعد میں

تھرمامیٹر لگائے۔ سائنسدانوں نے یہ دیکھا کہ عبادت کے دوران راہبوں کا درجہِ حرارت ۱۸ فارن ہائٹ بڑھ گیا۔ اگرچہ وہ برف میں بیٹھے تھے لیکن عبادت سے ان کا درجہِ حرارت اتنا بڑھا کہ ان کے جسم کے گیلے کپڑوں سے بھاپ نکلنے لگی۔ عبادت کے دوران ان کی سانس کی رفتار کم ہونے لگی اور آخر میں ایک منٹ میں سات سانسوں تک آ گئی۔ سانس کے کم ہونے سے دماغ میں Relaxation Response پیدا ہوئی۔

دالائے لامہ نے اپنے راہبوں کو نصیحت کی تھی

For skeptics, you must show something spectacular, because without that, they won't believe

دالائے لامہ کے مشورے پر راہبوں نے وہ کرتب دکھائے کہ ڈاکٹر بنسن اور ان رفقاءِ کار بہت متاثر ہوئے۔ جب ہم ان تجربات کی تفاصیل پڑھتے ہیں تو وہ روحانی تجربات سے زیادہ ہولی وڈ کی ایکٹنگ لگتے ہیں جن کا مقصد آفاقی شعور حاصل کرنے کی بجائے مغربی سائنسدانوں کو متاثر کرنا لگتا ہے۔

ڈاکٹر بنسن کو یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ راہب کئی برسوں بلکہ دہائیوں سے پہاڑوں کے غاروں میں بیٹھے عبادت کر رہے ہیں۔ وہ اپنی عبادت سے اپنے جسم کے مختلف حصوں اور کاموں functions پر قابو پا چکے ہیں۔ عبادت سے سردی میں بھی ان کی خون کی نالیاں نہیں سکڑتیں۔ عام انسان سردی سے ٹھٹھرتے ہیں بلکہ frostbite سے مر بھی جاتے ہیں لیکن وہ راہب اس سردی میں بھی عبادت سے اپنے جسم میں حرارت پیدا کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر بنسن نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ انسانی جسم اور ذہن کا گہرا رشتہ ہے۔ انسانی ذہن جسم کو متاثر کرتا ہے۔ کوئی بھی انسان ایسے طریقے سیکھ سکتا ہے جو سے وہ جسم کو ریلیکس relax کر سکے۔ انہوں نے اپنی تحقیق سے Faith Factor کا اضافہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں

The Relaxation Response when combined with the power of belief can lead to remarkable health promoting elements, which I have identified as Faith Factor"

اس Faith Factor سے ڈاکٹر بنسن مذہب کی روحانی روایت اور سیکولرزم کی

سائنسی روایت میں پل تعمیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس عبادت سے انسان کی

دل کی رفتار میں کمی

سانس لینے کی رفتار میں کمی

بلڈ پریشر میں کمی

دماغ کی لہروں کی رفتار میں کمی

واقع ہوتی ہے کیونکہ مراقبے سے جسم کی رفتار میں کمی ہو جاتی ہے۔ انسان کی پریشانی کم ہوتی ہے اور سکون بڑھ جاتا ہے۔

میرا ڈاکٹر بنسن کی تحقیق پر یہ اعتراض ہے کہ انہوں نے اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ مراقبے سے انسان ریلیکس relax تو ہو جاتا ہے ٹنشن tension میں عارضی طور پر کمی بھی آ جاتی ہے لیکن ان مسائل کا کیا ہوگا جو وہ ٹنشن Tension پیدا کرتے ہیں۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر بنسن بیہیورسٹ Behaviourist ہیں سائیکوتھیریپسٹ Psychotherapist نہیں ہیں۔ وہ انسان کو relax کرنا تو سکھا تے ہیں ان کے نفسیاتی مسائل کو حل کرنا نہیں بتاتے۔

مجھے ڈاکٹر بنسن کے راہبوں پر تجربات پڑھتے ہوئے یہ خیال بھی آیا کہ جب مسلمان نماز پڑھتے ہیں تو ان کی ورزش بھی ہو جاتی ہے لیکن کوئی شخص ورزش کرنے کے لیے نماز نہیں پڑھتا۔ کیونکہ نماز کا اصل مقصد خدا سے لو لگانا ہے ورزش کرنا نہیں۔ اسی طرح بدھسٹ راہبوں کا عبادت کرنے کا مقصد نروان حاصل کرنا اور آفاقی شعور حاصل کرنا ہے ریلیکس relax ہونا نہیں۔

مجھے ڈاکٹر بنسن اور دالائے لامہ کی کتابیں پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر بنسن ذہنی مریضوں کو ذہنی سکون دینا چاہتے ہیں دالائے لامہ اپنے بدھسٹ راہبوں کو نروان حاصل کرنے میں مدد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ دو ماہرین دو دنیاؤں کے باسی ہیں۔

ڈاکٹر بنسن کی تحقیق اور کتاب کا یہ اثر ہوا کہ مغربی دنیا میں meditation مقبول ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر بنسن کا شمالی امریکہ میں رہنے والوں کو یہ مشورہ ہے کہ وہ ہر روز۔۔ خاموش جگہ تلاش کریں۔۔۔ چند منٹوں کے لیے جسم کے اعضا کو ڈھیلا چھوڑ دیں۔۔ کسی ایک لفظ پر توجہ مرکوز کریں۔۔۔ چاہے وہ ۔۔۔ اوم ۔۔۔ ہو ۔۔۔ اللہ ہو۔۔۔

ہوڈاکٹر بنسن کا خیال ہے کہ چاہے وہ لفظ بے معنی ہی کیوں نہ ہو اس کا بھی اتنا ہی اثر ہوگا جتنا کسی مقدس لفظ کا۔ اس ایک لفظ پر توجہ مرکوز کرنے سے ذہن سکون حاصل کرتا ہے۔

ڈاکٹر بنسن کا مشورہ ہے کہ انسانی ذہن سے خیالات گزرتے ہیں انہیں روکیں نہیں۔ آہستہ آہستہ جب ذہن خیالات سے خالی ہو جائے گا تو وہ پرسکون ہو جائے گا۔

ڈاکٹر بنسن نے اپنی تحقیق کا نچوڑ ان الفاظ میں بیان کیا ہے

Whatever theological or philosophical reasons be given for the power of meditation in those cultures, the techniques all commonly elicit what we today call the Relaxation Response

دلچسپ بات یہ ہے مشرق میں خشوع و خضوع سے نماز پڑھنے اور عبادت کرنے کا مقصد خدا کی قربت ہے لیکن مغرب میں اس کا مقصد Relax ہونا سمجھا جاتا ہے۔ کسی کو عبادت سے Relaxation ملی کسی کو نروان۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو عورت سے جنس ملی کسی کو محبت۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

ڈاکٹر بنسن لکھتے ہیں

A bridge between two disciplines : traditional faith and meditation practices and scientific observation. I realize in stating this purpose that I am embarking along a thin line that separates two conflicting ways of thinking...and that this combination may be potentially problematic".

ڈاکٹر بنسن نے ایک پروگرام وضع کیا ہے جس کا مقصد مریضوں کے۔۔۔

سر کے درد کو کم کرنا
۔۔۔کمر کے درد کو کم کرنا
۔۔۔بلڈ پریشر کم کرنا
۔۔۔نیند بہتر کرنا اور

۔۔ذہنی پریشانی اور اینزائٹی anxiety کو کم کرنا ہے۔

اس پروگرام سے مغربی سائنسدان اب ہر سال لاکھوں ڈالر کما رہے ہیں۔

دالائے لامہ کے بدھسٹ بزرگوں کو خطرہ تھا کہ ان کی روحانی تعلیمات کے راز جب مغرب میں جائیں گے تو وہ سرمایہ داری نظام کا حصہ بن جائیں گے جہاں کے سائنسدان روحانیت بیچنے لگیں گے۔

مشرق سے بدھسٹ راہب جو عرفان دس برس کی عبادت اور مراقبے سے حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ مغرب کے باسی اپنی نہایت ہی مصروف زندگی fast life میں دس منٹ کی meditation سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ دلائے لامہ اور ڈاکٹر بنسن کا انسانیت کو تحفہ ہے۔

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

ڈاکٹر وکٹر فرینکل۔۔نفسیات اور روحانیات

ڈاکٹر وکٹر فرینکل بیسویں صدی کے ایک ایسے اہم اور مشہور دانشور اور نفسیاتی معالج ہیں جنھوں نے لاکھوں لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کیا۔ ان کی کتاب Man's Search for Meaning بہت سے ملکوں میں Bestseller رہی اور اس کے بیسیوں زبانوں میں ترجمے ہوئے۔اس کتاب میں انہوں نے اپنے نازی کیمپ Concentration Camp کے تجربات بیان کیے ہیں جن کے دوران ان کے خاندان کے بہت سے افراد مار دیے گئے۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے نئے طرزِ علاج لوگو تھیریپیLogotherapy کی تفاصیل بھی لکھی ہیں۔ اس طرزِ علاج میں مریض کی مدد کی جاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے جذباتی اور سماجی مسائل سے نبردآزما ہونے کے لیے ان میں معانی تلاش کرے۔ وہ معانی اس مریض کو ان مسائل کا حل تلاش کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ فرینکل کے طرزِ علاج کو اتنا سراہا گیا کہ انہیں نوبل امن انعام کے لیے نامزد کیا گیا۔ اوسٹریاAustria کے شہر ویئنا

Vienna میں سگمنڈ فرائڈSigmund Freud اور الفریڈ ایڈلر Alfred Adler کے بعد تیسرا مکتبِ فکر وکٹر فرینکلVictor Frankl کا ہے جس نے بیسویں صدی کے نفسیات کے علم میں گرانقدر اضافے کیے اور انسانی نفسیات کے علم میں روحانی پہلوکو روشناس کروایا۔

وکٹر فرینکل کا کہنا ہے کہ سگمنڈ فرائڈ نے انسانی لاشعور میں صرف جبلتInstinct پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ انہوں نے کہا جہاں انسانی لاشعور میں نفسانی

خواہشات موجود ہیں وہیں اس میں روحانی خواہشات بھی موجود ہیں جنہیں سگمنڈ فرائڈ نے نظر انداز کیا تھا۔ یہ علیحدہ بات کہ وکٹر فرینکل کی

روحانیت انسانیت کا حصہ ہے اس کا روایتی مذہب اور خدا سے کوئی تعلق نہیں۔ وکٹر فرینکل کا فلسفہ انسان دوستی Humanism کے فلسفے کا حصہ ہے۔

سگمنڈ فرائڈ کے لاشعور کا تصور انفرادی اور جنسی ہے کارل ینگ کے لاشعور کا تصور اجتماعی اور روحانی ہے وکٹر فرینکل کے لاشعور کا تصور انفرادی اور روحانی ہے۔ اس طرح ان کے لاشعور کے تصور میں فرائڈ اور ینگ کے تصورات کا حسین امتزاج ہے۔

وکٹر فرینکل کے روحانی لاشعور کے تصور کے مندرجہ ذیل حصے ہیں۔

۱۔ ضمیر۔۔وکٹر فرینکل کا کہنا ہے کہ انسانی ضمیر انسان کے روحانی لاشعور کا حصہ ہے جو اسے اچھے برے' نیک اور بد کاموں کا فرق بتاتا ہے اور ایک بہتر انسان بننے کی ترغیب دیتا ہے۔یہ ضمیر مذہبی' غیر مذہبی اور لامذہبی سبھی انسانوں میں موجود ہوتا ہے۔

۲۔ محبت۔۔وکٹر فرینکل کے روحانی لاشعور کا دوسرا حصہ محبت ہے۔ ہر انسان میں محبت کرنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے محبت بھرے رشتے استوار کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے عزیزوں کو بہتر طور پر جاننے کے قابل ہوتا ہے۔

۳۔ تخلیقیت۔۔وکٹر فرینکل کے لاشعور کا تیسرا حصہ فنونِ لطیفہ تخلیق کرنا اور ان سے محظوظ ہونا ہے۔ وکٹر فرینکل اپنے مریضوں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا مشورہ دیتے تھے۔

۴۔ مذہبی تجربات۔۔بہت سے لوگوں کو مذہبی تجربات ہوتے ہیں، وکٹر فرینکل سگمنڈ فرائڈ سے متفق نہیں کہ ان تجربات کا جنسی خواہشات سے کوئی تعلق ہے۔

۵۔ آفاقی شعور کے تجربات۔۔وکٹر فرینکل کا کہنا ہے کہ بعض لوگوں کو آفاقی شعور کے تجربات ہوتے ہیں کیونکہ ان کے لاشعور میں خدا موجود ہوتا ہے۔فرینکل اسے لاشعوری خدا Unconscious God کہتے ہیں۔ جو صدیوں کے مذہبی اور روحانی تجربات کی وجہ سے انسانی لاشعور کا حصہ بن گیا ہے۔ یہ بات اہم

ہے کہ فرینکل کا خدا اس خدا کے تصور سے مختلف ہے جو ساتویں آسمان کے اوپر عرش پر بیٹھا حکومت کرتا ہے۔

وکٹر فرینکل کا کہنا تھا کہ فرائڈ کے لاشعور میں صرف libido تھا اس نے انسانی لاشعور کےReligo کو نظر انداز کیا۔ فرینکل نے کہا فرائڈ یہ نہ جان پایا کہ انسان کے لاشعور میں ایک جانور ہی نہیں ایک فرشتہ بھی چھپا بیٹھا ہے۔

وکٹر فرینکل نے اپنے لاشعور کے نظریات کو اپنے نفسیاتی علاج Logotherapy کا حصہ بنایا اور دوسرے ماہرینِ نفسیات کو دعوت دی کہ وہ بھی انسانی شخصیت کے روحانی پہلو پر غور کریں۔ تا کہ وہ انسان کی نفسیاتی خواہشات کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی خواہشات کے بارے میں بھی آگاہی حاصل کریں اور اپنے دکھوں کو سکھوں میں بدل سکیں۔

وکٹر فرینکل کا کہنا تھا کہ ان سو مریضوں میں سے جو ماہرینِ نفسیات کے پاس علاج کروانے آتے ہیں ان میں سے بیس اس لیے ذہنی طور پر پریشان ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی بے معنی ہو گئی ہوتی ہے۔ وکٹر فرینکل کیLogotherapy انہیں اپنی زندگی میں معانی تلاش کرنے میں مدد کرتی ہے۔

جہاں وکٹر فرینکل کو بہت سے نفسیات دان پسند کرتے ہیں وہیں سیکولر اور دہریہ ماہرین ان پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ ماہرِ نفسیات سے زیادہ روحانی پیشوا ہیں جنھوں نے مذہبی اور سیکولر روایات کے درمیان فرق کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔

وکٹر فرینکل کو اس اعتراض کا اندازہ تھا اسی لیے انہوں نے کہا کہ ہر انسان کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بے معنی بنائے یا بامعنی۔

عارف عبدالمتین کا شعر ہے

میں نے خود کاٹی ہے اپنی زندگی
مجھ سے بڑھ کر کون ہے دشمن مرا

وکٹر فرینکل کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کو بھی بامعنی بنانے کی کوشش کی اور دوسروں کو بھی بامعنی زندگی گزارنے کی ترغیب دی۔

جن لوگوں نے وکٹر فرینکل کا ساتھ وقت گزارا وہ جانتے ہیں کہ وکٹر فرینکل

ایک ہمدرد انسان تھے۔ انہیں سب انسانوں میں، چاہے وہ لوگ مذہبی ہوں یا دہریہ، ان میں خدائی صفات نظر آتی تھیں۔ان کا کہنا تھا کہ ہر انسان ہر حالت میں آزاد ہے، خود مختار ہے۔اس سے تمام چیزیں چھینی جا سکتی ہیں سوائے اس کی روحانی آزادی کے۔

بیسویں صدی میں جہاں برٹنڈرسل اور ژاں پال سارتر کی تعلیمات کی وجہ سے مذہبی، غیر مذہبی اور لامذہبی انسانوں کے درمیان مکالمے میں خلیجیں پیدا ہو گئی تھیں وکٹر فرینکل کی تعلیمات نے ان کے درمیان پل تعمیر کرنے کی کوشش کی۔

جب ہم وکٹر فرینکل کا سوانح حیات پڑھتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک ماہرِ نفسیات ہی نہ تھے ایک درویش صفت انسان بھی تھے۔ انہوں نے نازی کیمپ میں طویل عرصہ گزارنے کے بعد معرفت کی منازل طے کیں اور دانائی کے وہ راز جانے جنہیں انہوں نے اپنی کتابوں میں پیش کیا۔ان کا کہنا تھا

خدمتِ خلق سب سے بڑی عبادت ہے

اپنی وفات سے پہلے جب وکٹر فرینکل کینیڈا آئے تو ٹورانٹو میں سینکڑوں لوگوں کو انہیں دیکھنے اور ان کا لیکچر سننے کا موقع ملا۔لوگوں نے بڑی عزت اور احترام سے ان کا استقبال کیا اور بڑے تحمل سے ان کی دانائی کی باتیں سنیں۔ میری خوش بختی کہ میں بھی اس شام ان کے سامعین میں شامل تھا۔

O

روحانی تجربات کا تجزیہ

جب ہم ان لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں جن کا دعوہ تھا کہ وہ خدا سے ہمکلام ہوئے ہیں اور انہیں روحانی تجربات ہوئے ہیں تو ہم انہیں چار گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں

پہلا گروہ۔۔۔ذہنی مریض

دوسرا گروہ۔۔۔سنت، سادھو، صوفی

تیسرا گروہ۔۔۔مرگی کے مریض

چوتھا گروہ۔۔۔عام انسان

پہلا گروہ۔۔۔ذہنی مریض

پچھلی چند دہائیوں میں میں نے نفسیاتی معالج کے طور پر کئی ذہنی امراض کے ہسپتالوں میں کام کیا ہے۔ میری کئی ایسے ذہنی مریضوں سے ملاقات ہوئی ہے جن کا کہنا تھا کہ وہ خدا سے ہمکلام ہوتے ہیں۔وہ کئی مذہبی توہمات delusions کا بھی شکار تھے۔

ایک مرد نے کہا 'میں عیسیٰ ہوں I am Jesus Christ

ایک عورت نے کہا 'میں مریم ہوں I am Virgin Mary

مجھے کئی ایسے مریضوں کا علاج کرنے کا بھی موقع ملا جو کہتے تھے انہیں خدا اور فرشتوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں (Hallucinations) جو انہیں کچھ کرنے کا حکم دیتے ہیں اور وہ ان احکام پر عمل بھی کرنا چاہتے ہیں۔یہ احکام مریضوں کے رشتہ داروں کے

لیے بہت پریشان کن تھے۔

پاکستان میں میرے ایک مسلمان مریض نے نرس کو بتایا کہ اسے خواب میں خدا نے بتایا تھا کہ وہ ابراہیم ہے اور اسے اپنے بیٹے کی قربانی دینی ہے۔ہمیں اس سکزوفرینیا کے مریض کا ادویہ سے علاج کرنا پڑا اور اس کے خاندان کو بتانا پڑا کہ وہ اس کے بیٹے کا خیال رکھیں تا کہ وہ محفوظ رہے۔ہسپتال کے چند ماہ کے علاج کے بعد مریض کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ذہنی مرض کا شکار تھا اور وہ خواب اس کی بیماری کا حصہ تھا۔

سکزوفرینیا کے مریضوں میں مذہبی علامات کے علاوہ ذہنی مرض کی اور علامات بھی موجود ہوتی ہیں۔ نہ وہ کھانا کھا سکتے ہیں نہ سو سکتے ہیں۔ وہ دن بھر حیران و پریشان رہتے ہیں۔بعض کا ذہنی بحران اتنا شدید ہوتا ہے کہ اگر ان کا مناسب علاج نہ ہو سکے تو وہ خودکشی کر لیتے ہیں۔وہ لوگ جو ماہرین نفسیات سے اپنا علاج کرواتے ہیں وہ علاج سے اپنی بیماری کو کنٹرول کر لیتے ہیں ۔صحتمند ہونے کے بعد انہیں خدا اور فرشتوں کی آوازیں آنی بند ہو جاتی ہیں۔

جب ہم ذہنی امراض کی شماریات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا میں ایک فیصد لوگ سکزوفرینیا کا شکار ہوتے ہیں۔جن بچوں کی ماں یا باپ ذہنی مرض کا شکار ہو ان کے ذہنی مرض کا شکار ہونے کے امکانات ایک سے دس فیصد ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک جڑواں بچہ ذہنی مرض کا شکار ہو تو دوسرے جڑواں بچے کے مریض ہونے کے امکانات پچاس سے ستر فیصد ہو جاتے ہیں۔ اس تحقیق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ذہنی مرض موروثی مرض ہے۔ایسے بچوں کے دماغ میں ڈوپامین Dopamine' نور ایڈرینالین Nor-adrenaline' اور سیروٹونن Serotonin جیسے کیمیائی مادوں کی کمی ہوتی ہے اور جب وہ جذباتی الجھنوں کا شکار ہوتے ہیں تو ذہنی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ایسے مریضوں کو ماہرینِ نفسیات سے مشورہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ وہ اپنے ذہنی امراض اور نفسیاتی مسائل کا علاج کروا سکیں۔

دوسرا گروہ۔۔۔۔سنت' سادھو' صوفی

پچھلی چند دہائیوں میں میں نے بہت سے سنتوں' سادھوؤں اور صوفیوں کی

سوانح عمریاں پڑھی ہیں جن میں انہوں نے اپنے روحانی تجربات کا ذکر کیا تھا۔ یہ ایسے تجربات تھے جن کی وجہ سے انہوں نے سلوک کی منزلیں طے کر کے معرفت حاصل کی تھی۔ میں یہاں بیسویں صدی کے ایسے دو انسانوں کا ذکر کروں گا جنہوں نے اپنے روحانی تجربات کو بیان کیا ہے۔

میتر یا بیسویں صدی کے سادھو تھے جن کا دعوہ تھا کہ وہ بدھا کا نیا جنم ہیں۔ وہ اپنی کتاب 'امن کے صحیفے' Gospel of Peace میں لکھتے ہیں' جب کوئی شخص صحیفہ لکھتا ہے تو وہ صحیفہ اسے ایک نئی زندگی دیتا ہے اور وہ شخص روحانی طور پر دوبارہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہ تجربہ ہے جو مختلف روایتوں میں مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے۔ کوئی اسے معرفت' کوئی سیتوری' کوئی اناالحق اور کوئی آفاقی شعور کا نام دیتا ہے'

میتر یا اپنے ایک روحانی تجربے کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں' تقریباً چار بجے صبح مجھے ایک یزدانی قوت نے جگا دیا پھر مجھے ایک غیبی آواز آئی جس نے کہا "اپنا قلم اٹھاؤ اور لکھو۔ میں تمہیں آخری صحیفہ دینا چاہتا ہوں جو امن کا صحیفہ Gospel of Peace کہلائے گا۔

'اس کائنات کا نہ کوئی آغاز تھا اور نہ انجام ہوگا۔ نہ اس کی پیدائش ہے نہ موت۔ میں نے اپنے سوا کچھ تخلیق نہیں کیا'۔

میتر یا کا دوسرا نام پروفیسر ہانڈا Professor Handa تھا۔ وہ ٹورانٹو یونیورسٹی میں سوشیالوجی کے پروفیسر تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۹۰ء میں ہوا۔ ان کے بہت سے طالب علم اور پیروکار ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کے ایک اور روحانی رہنما کرشنا مورتی تھے۔ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ جب ان کی ملاقات Theosophic Society of India کی دانشور Anne Bessant سے ہوئی تو این Anne کو اس بچے میں روحانیت کی جھلکی نظر آئی چنانچہ وہ کرشنا مورتی اور ان کے بھائی کو انگلستان لے آئیں تا کہ اس بچے کی روحانی خطوط پر تربیت کی جائے۔

۱۹۲۲ء میں کرشنا مورتی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے سڈنی آسٹریلیا گئے جہاں ان کی ملاقات روحانیات کے استاد لیڈ بیٹر Leadbeater سے ہوئی۔ پھر کرشنا مورتی

کیلی فورنیا آئے جہاں سے ان کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔وہاں انہوں نے روحانیت کی ریاضت کی تا کہ انہیں نروان حاصل ہو سکے۔وہ اس راستے پر چل پڑے جس کی معراج کنڈالینیKundalini کا روحانی تجربہ ہے۔ اس تجربے میں انسان کا شعور اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں عام انسانوں کی رسائی نہیں ہوتی۔ اپنے ایک ایسے ہی تجربے کا ذکر کرشنامورتی این بیسنٹ کے نام خط میں ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

'انیس تاریخ کو میں روحانی معراج پر پہنچا۔ میری سوچ معطل ہو گئی اور میں سارا دن بستر میں لیٹا رہا۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بیہوش ہو رہا ہوں لیکن میں اس بیہوشی میں بھی پوری طرح ہوش میں تھا۔اس دن مجھے ایک غیر معمولی تجربہ ہوا۔ میں گھر کے باہر بیٹھا تھا۔ مجھے ایک مزدور نظر آیا جو سڑک کی مرمت کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہتھوڑی تھی جس سے وہ پتھر توڑ رہا تھا۔ اس کے ایک طرف گھاس تھی اور دوسری طرف درخت جس پر پرندے بیٹھے تھے۔قریب سے ایک کار گزر رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں بیک وقت مزدور بھی تھا' پتھر بھی اور ہتھوڑی بھی۔ میں گھاس بھی تھا پرندہ بھی اور درخت بھی۔میں گاڑی بھی تھا اور سڑک بھی۔ میں اپنے ماحول کی ہر چیز میں موجود تھا اور ہر چیز مجھ میں موجود تھی۔میں اس جذب کے عالم میں سارا دن رہا۔اس دن میرے اندر سے روشنی پھوٹنے لگی۔اس دن میں خدا میں اور خدا مجھ میں تحلیل ہو گیا'

کرشنامورتی کو کئی مہینوں تک ایسے روحانی تجربات ہوتے رہے۔کئی دفعہ تو کرشنامورتی کی حالت اتنی ناگفتہ بہہ ہوئی کہ ان کے بھائی اور دوستوں کو فکر ہوئی کہ کہیں وہ مجذوب نہ بن جائیں یا پاگل نہ ہو جائیں۔

کئی مہینوں کی تپسیا اور ریاضت کے بعد کرشنامورتی پر ان کی زندگی کا مقصد منکشف ہو گیا۔انہوں نے فروری ۱۹۲۷ء کو لیڈ بیٹر کو ایک خط میں لکھا 'مجھ پر میری زندگی کا راز واضح ہو گیا ہے۔میں شعور کی ایک نئی منزل سے متعارف ہوا ہوں' پھر ۱۹۲۹ء میں ایک خط میں لکھا 'خواب مکمل ہو گیا ہے میں آزاد ہو گیا ہوں'۔ جب انہیں معرفت مل گئی تو انہوں نے Theosophic Society سے استعفیٰ دے دیا اور ایک درویشانہ زندگی گزارنی شروع کر دی۔انہوں نے اپنے فلسفے کو ان الفاظ میں بیان کیا۔'سچ تک پہنچنے کے لیے کسی راستے' کسی مسلک اور کسی مذہب کی ضرورت نہیں۔ سچ بے پایاں اور بے کراں ہے۔سچ

آزاد ہے۔ اسے کسی روایت میں قید نہیں کیا جا سکتا۔'

معرفت حاصل کرنے کے بعد کرشنا مورتی ایک درویش کی طرح نصف صدی تک ساری دنیا میں گھومے اور اپنے علم، تجربے اور دانائی سے لوگوں کے دلوں میں آگہی کی شمعیں جلائیں۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ انہیں مذہب کی شاہراہ کو چھوڑ کو اپنے من کی پگڈنڈی پر چلنا چاہیے۔ کرشنا مورتی کے پرستاروں میں ہندوستان کی تین نسلوں کے وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی شامل تھے۔ ان کے چاہنے والوں اور ان سے فیض حاصل کرنے والوں میں تبت کے بزرگ دالائی لاما، Dalai Lama برطانیہ کے ماہرِ نفسیات آر ڈی لینگ R D Laing اور امریکہ کے فلاسفر جوزف کیمبل Joseph Campbell بھی شامل تھے۔ کرشنا مورتی بیسویں صدی کے معتبر اور موقر ماہرینِ روحانیات میں سے ایک تھے۔

ذہنی مریضوں اور روحانی پیشواؤں کا مقابلہ

جب ہم جدید سائنس اور سیکولر نفسیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں مغربی ماہرینِ نفسیات یہ بتاتے ہیں کہ ایک سادھو اور ایک ذہنی مریض کے تجربات میں بہت فرق ہے۔ ذہنی مریض اپنے مذہبی تجربات کے بعد ذہنی بحران کا شکار میں ہو جاتا ہے اور اس کی شخصیت میں شکست و ریخت ہونے لگتی ہے

وہ اندر سے ٹوٹنے پھوٹنے لگتا ہے۔ اس کے مقابلے میں سنت، سادھو اور صوفی کی شخصیت میں اس کے روحانی تجربات سے نشوونما ہوتی ہے اور وہ ایک بہتر انسان بن جاتا ہے۔ روحانی تجربات اس کی زندگی کو نئے آدرش دیتے ہیں اور اس کی زندگی میں نیا مقصد پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک امریکی ماہرِ نفسیات سلوونو اریٹی Silvano Arieti سکزوفرینیا کے ذہنی مریض اور صوفی کے روحانی تجربات کا نفسیاتی مقابلہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ 'صوفی کے روحانی تجربات سے اس کی خود اعتمادی کو بڑھاوا ملتا ہے۔ ان تجربات سے اس کی زندگی میں نئے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اسے اپنی قوم کو سنوارنے اور خدمتِ خلق کرنے کا نیا مشن mission ملتا ہے۔ صوفی کا روحانی تجربہ نفسیاتی طور پر خود ساختہ

ہپنوسسauto-hypnosis کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس تجربے میں صوفی شعور کی ایک اعلیٰ کیفیت سے روشناس ہوتا ہے اور اپنے ذہن کا تعلق یزداں سے جوڑتا ہے۔ یہ تعلق مختصر وقفے کا ہوتا ہے جس کے بعد وہ صوفی عام شعوری کیفیت میں پوری طرح لوٹ آتا ہے۔

صوفی کے روحانی تجربے کے مقابلے میں ذہنی مریض کا مذہبی تجربہ اس کی شخصیت کا شیرازہ بکھیر دیتا ہے۔

صوفی کا تجربہ نفسیاتی حوالے سے مثبت جبکہ ذہنی مریض کا تجربہ صحت کے حوالے سے منفی تجربہ ہوتا ہے۔'

مغرب کے سائنسدان اور ماہرینِ نفسیات صوفی کے تجربات اور ذہنی مریض کے تجربات کو دو مختلف خانوں میں بانٹتے ہیں لیکن مشرق کے روحانی ماہرین ان کے تجزیے سے اتفاق نہیں کرتے ۔ جون وائٹJohn White اپنی کتاب معرفت کیا ہے؟ what is enlightenment? میں لکھتے ہیں ' انسانی شعور کے تین درجات ہیں۔ پہلا درجہ آرتھونویا arthonoia کہلاتا ہے جو عام انسانوں کا شعور ہے۔ دوسرا درجہ پیرانویا paranoia ہے جس میں انسانی شعور اپنا توازن کھوسکتا ہے اور ذہنی مریض بن سکتا ہے۔ تیسرا درجہ میٹانویاmetanoia کہلاتا ہے جو انسانی شعور کا اعلیٰ ترین درجہ ہے جہاں تک رسائی صرف سنت' سادھو اور صوفی کو ہوتی ہے۔' وائٹ کا خیال ہے کہ مغربی ماہرینِ نفسیات چونکہ روحانی تجربات سے نابلد ہیں اس لیے وہ پیرانویا کو ذہنی مرض سمجھتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ پیرانویا آرتھونویا اور میٹانویا کے راستے میں ایک پڑاؤ ہے ایک پل ہے۔ مشرق کے روحانی پیشوا اس خطرے سے واقف ہوتے ہیں اس لیے وہ اپنے شاگردوں' پیروکاروں اور مریدوں کی مدد کرتے ہیں کہ وہ اس پل پر زیادہ دیر نہ ٹھہریں اور جلد از جلد روحانیت کی اگلی سطح پر پہنچ جائیں اور معرفت حاصل کریں۔'

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اکثر مغربی ماہرینِ نفسیات مشرقی روحانی روایت سے واقف نہیں اور اکثر مشرقی روحانی پیشوا مغربی سائنس اور نفسیات کی روایت سے واقف نہیں اس لیے ان کے درمیان مکالمہ نہیں ہو پاتا۔

وہ لوگ جو مشرقی روحانی روایت اور مغربی سائنسی روایت' دونوں روایات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ دونوں روایات بعض دفعہ ایسے الفاظ اور اصطلاحیں استعمال

کرتی ہیں جن کے معنی دونوں روایات میں بہت مختلف ہیں۔اس کی ایک مثال ایگو ہے

ایگو EGO

مشرقی ماہرینِ روحانیات اور مغربی ماہرینِ نفسیات دونوں اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں لیکن دونوں روایات میں اس کے معنی جدا جدا ہیں۔جیمز فیڈیمین James Fadiman اور رابرٹ فریگر Robert Frager اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

'روحانی روایت میں ایگو شخصیت کے کمزور حصے کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جو جذباتی فیصلے کرتا ہے اور انسان کی شخصیت میں غرور اور تکبر پیدا کرتا ہے۔ اس ایگو کو جتنا مٹایا جائے اتنا بہتر ہے۔ ایک درویش اس ایگو کو ختم کر کے عاجزی، حلیمی اور کسرِ نفسی پیدا کرتا ہے۔'

اس کے مقابلے میں جیمز گارڈن James Gordon اس اصطلاح کا نفسیات کی روایت میں مطلب یوں بیان کرتے ہیں' فرائڈ نے انسانی ذہن کے تین حصے بتائے ہیں۔ اڈ Id جو انسانی جبلتوں کی نمائندگی کرتا ہے ایگو Ego جو انسانی شخصیت کے صحتمند پہلو کی نمائندگی کرتا ہے اور سوپرا یگو Superego جو انسانی اور سماجی شعور کی نمائندگی کرتا ہے۔'

مشرقی روحانی روایت کا ایگو مغربی نفسیاتی روایت کا ID ہے جو انسانی شخصیت کا منفی اور غیر صحتمند پہلو ہے جبکہ مغربی نفسیاتی روایت کا ایگو انسانی شخصیت کا مثبت اور صحتمند پہلو ہے۔ اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک ہی لفظ کا استعمال کس طرح کنفیوژن confusion پیدا کر سکتا ہے۔

مشرق کے روحانی پیشوا ایگو کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور مغرب کے نفسیاتی معالج ایگو کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں کیونکہ دونوں کی نگاہ میں ایگو شخصیت کے بالکل مختلف حصوں کے نام ہیں۔

تیسرا گروہ۔۔۔۔مرگی کے مریض

مختلف ہسپتالوں کے ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ اور نفسیاتی وارڈ میں کام کرنے کے

دوران میری کئی ایسے مریضوں سے ملاقات ہوئی جن کے نفسیاتی عوارض سے یوں لگتا تھا جیسے وہ سکزوفرینیا کے مریض ہوں کیونکہ انہیں غیبی آوازیں بھی آتی تھیں(hallucinations) اور وہ عجیب وہ غریب توہمات(paranoid delusions) کا بھی شکار تھے لیکن جب انہیں سکزوفرینیا کی دوا دی جاتی تھی تو ان کی بیماری پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ مریض اپنے ڈاکٹروں اور ماہرینِ نفسیات کے لیے ایک معمہ تھے۔ آخر جب ان مریضوں کے دماغ کی لہروں کا ای ای جیEEG ٹیسٹ کیا گیا تو واضح ہوا کہ وہ مرگی Epilepsy کے مریض ہیں اور جب ان کا مرگی کی ادویہAnti-epiletics سے علاج کیا گیا تو وہ شفایاب ہو گئے۔وہ لوگ ٹمپورل لوب کی مرگی Temporal Lobe Epilepsy کا شکار تھے۔

ٹمپورل لوب کا معمہ Mystery of Tempral Lobes

وہ ماہرین Neurologists جو دماغ کے مختلف حصوں کا مطالعہ اور تحقیق کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ انسان کے دماغ کے دائیں حصے Right Brain کا انسان کے تخلیقی Creative اور روحانی Spiritual تجربات سے گہرا تعلق ہے۔

ڈاکٹر رابرٹ بکمین Dr Robert Buckman نے اپنی کتاب Can We Be Good Without God میں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ میں یہاں اس گفتگو کو خلاصہ پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر بکمین کا کہنا ہے کہ انسان کے دماغ کے دو حصے ہیں۔ بائیں دماغ Left Brain کا تعلق زبان اور گفتگو سے ہے جبکہ دائیں دماغ Right Brain کا تعلق اپنی ذات اور کائنات کی پہچان اور شعور سے ہے۔ ۱۹۴۰ء سے انسانی دماغ کی لہروں کے ٹیسٹ EEG..Electroencephalography کے ٹیسٹ نے ہمیں اس معمہ کو حل کرنے میں مدد کی ہے۔ بکمین نے ہمیں بتایا کہ دائیں دماغ کی حساسیت کی وجہ سے ہم انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کے دائیں دماغ کے ٹمپورل لوب Right Temporal Lobes حد سے زیادہ حساس ہیں۔ جب یہ حصے خود بخود فعال ہو جاتے ہیں تو انسانوں پر مرگی کے دورے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ہیولنگز جیکسن Dr

Hughlings Jackson نے مرگی کے مریضوں پر تحقیق کر کے ہمیں بتایا کہ دائیں دماغ کی ٹمپورل لوگ کی مرگی کا تجربہ روحانی تجربے سے مشابہت رکھتا ہے۔ ایسے مریض کی ایک مثال مشہور لکھاری فیودور داستووسکی Fyodor Dostovesky تھا جسے مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ وہ اپنے ٹمپورل لوب کی مرگی کے دورے کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے ' میرے شعور میں اچانک حیرت انگیز تبدیلی آئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری روح میں ایک در کھل گیا ہو اور اس میں روشنی داخل ہو رہی ہو۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ عین ممکن ہے کہ بعض سنت اور سادھو ٹمپورل لوگ کی مرگی کے مریض ہوں۔

ڈاکٹر وائلڈر پینفیلڈ Dr Wilder Penfiel نے بھی دماغ پر کافی تحقیق کی ہے۔ ان کی تحقیق ہمیں بتاتی ہے کہ جب انسانی دماغ کے بائیں حصے Left Brain کو لیبارٹری میں stimulate کیا جاتا ہے تو جسم کے مختلف حصوں میں حرکت involuntary movement ہوتی ہے لیکن جب دائیں دماغ کے ٹمپورل لوب Right Temporal Lobe کو stimulate کیا جاتا ہے تو جسم کے کسی حصے میں حرکت نہیں ہوتی بلکہ انسانی شعور میں تبدیلی آتی ہے اور اسے کسی اور ہستی کے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو یوں لگتا ہے جیسے ان کا کسی فرشتے یا خدا سے رشتہ جڑ گیا ہے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کا دائیں دماغ کے ٹمپورل لوب حساس ہے لیکن حد سے زیادہ نہیں۔ ایسے لوگ فنکار بنتے ہیں۔ چاہے وہ شاعر ہوں، ادیب ہوں یا ایکٹر۔ وہ ایک خیالی دنیا میں چلے جاتے ہیں اور فن پارے تخلیق کرتے ہیں۔

تیسرا گروہ عام لوگوں کا ہے جن کے دائیں ٹمپورل لوب حساس نہیں ہوتے۔ انہیں نہ تو مرگی کے دورے پڑتے ہیں اور نہ ہی وہ شاعر، ادیب یا ایکٹر ہوتے ہیں۔

سائنسدان ایم اے پرسنگر M A Persinger نے اپنی تحقیق سے ہمیں یہ بتایا کہ اگر ہم عام انسانوں کے دائیں ٹمپورل لوب کو stimulate کریں تو انہیں بھی روحانی تجربات ہوتے ہیں۔ وہ پرسکون محسوس کرتے ہیں اور انہیں لگتا ہے کہ وہ کسی ماورائی طاقت کے ساتھ جڑ گئے ہیں۔ بعض کو تو فرشتوں یا خدا کی آواز بھی آتی ہے۔

مرزا غالب کا مشہور شعر ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غالبؔ کا خیال تھا کہ شاعر کو بھی فرشتے کی غیبی آواز سنائی دیتی ہے جو اسے شعر لکھواتا ہے۔ اسے آمد ہوتی ہے اور وہ شاعر وہ شعر رقم کر لیتا ہے۔ یہ دائیں دماغ کے ٹمپورل لوب کا کرشمہ اور کرامت ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم تخلیقی اور روحانی تجربات کو سائنس اور نفسیات کے علم سے کیسے سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ماہرِ نفسیات جیولین جینز Julian Jaynes ہماری مدد کرتے ہیں۔ وہ ان تجربات کی اس طرح تشریح کرتے ہیں کہ انسان ایک طویل عرصے تک یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے دماغ کے دو حصے ہیں دایاں دماغ اور بایاں دماغ Right Brain and Left Brain بائیں دماغ کا تعلق زبان سے ہے اور دائیں دماغ کا تعلق تصورات .imagination سے ہے۔ شاعر کے اشعار دائیں دماغ میں تخلیق ہوتے ہیں لیکن جب وہ بائیں دماغ میں آتے ہیں تو بایاں دماغ یہ سمجھتا ہے کہ وہ باہر سے آئے ہیں اگر وہ شخص مذہبی اعتقادات رکھتا ہے تو وہ ان کا رشتہ کسی فرشتے یا خدا سے جوڑتا ہے۔ اگر وہ شخص دہریہ ہے تو وہ اس کا تعلق اپنے لاشعور سے جوڑتا ہے۔

ڈاکٹر بکمین کا کہنا ہے کہ ہم کسی شخص کے دائیں ٹمپورل لوب کو stimulate کریں تو اسے روحانی تجربہ ہو سکتا ہے اور وہ اس تجربے کا تعلق کسی فرشتے یا خدا سے جوڑ سکتا ہے۔ بکمین مذاہبیہ انداز میں کہتے ہیں کہ خدا ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے God is a state of mind.

جب ہم روحانیات کا سائنس اور نفسیات کے آئینے میں مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ تجربہ ہے اور دوسرا اس کی تعبیر و تفہیم۔ وہ تجربات جنہیں ہم روحانی تجربات کہتے ہیں وہ کسی انسان کو بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ شخص مذہب پر یقین رکھتا ہے تو وہ اس کا تعلق کسی فرشتے یا خدا سے جوڑتا ہے لیکن اگر وہ لامذہب ہے تو وہ اس کا تعلق اپنے لاشعور سے جوڑتا ہے۔ روحانی تجربات دہریوں کو بھی ہو سکتے ہیں۔ سیکولر سائنسدانوں اور ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ روحانی تجربات کا تعلق انساں سے ہے یزداں سے نہیں۔

Spirituality is part of humanity not divinity.

چوتھا گروہ۔۔۔عام انسان

روحانیات کی نفسیات کے سلسلے میں بیسویں صدی کے ایک اور ماہرِ نفسیات ابراہم میسلو Abraham Maslow نے ہمارے علم میں اضافہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک مسئلہ زبان کا ہے۔ چونکہ ہم روحانی تجربات کے لیے مذہبی زبان استعمال کرتے آئے ہیں اس لیے ہمیں مشکلات پیش آئی ہیں۔ ان کا مشورہ تھا کہ ہم ایسے تجربات کے لیے جو روحانی تجربات کہلاتے تھے نئے الفاظ اور اصطلاحیں استعمال کریں کیونکہ ان تجربات کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ میسلو نے ان تجربات کو روحانی تجربات کہنے کی بجائے پیک تجرباتPeak experiences کا نام دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ تجربات کسی انسان کو بھی ہو سکتے ہیں چاہے وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی پکا عیسائی ہو یا پکا دہریہ اور ان تجربات کا ہم سائنس اور نفسیات کے علم اور تحقیق سے اسی طرح مطالعہ اور تجزیہ کر سکتے ہیں جیسے کسی اور انسانی تجربے کا اس طرح اس تحقیق کے نتائج کو مذہبی اور غیر مذہبی دونوں گروہ قبول کر سکتے ہیں۔ میسلو کا کہنا تھا کہ معمولی لوگوں کو غیر معمولی تجربات ہو سکتے ہیں جن کا ان کے ایمان سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسے تجربات غروبِ آفتاب دیکھتے ہوئے، موسیقی سنتے ہوئے، بچوں سے کھیلتے ہوئے بھی ہو سکتے ہیں۔ میسلو نے ان پیک تجرباتpeak experiences کا گہرا مطالعہ اور تجزیہ کیا اور اپنی تحقیق کے نتائج کو اپنی کتابReligions, Values and Peak experiences میں چھاپا۔ یہ کتاب روحانیات کی نفسیات میں اہم اضافہ ہے۔

البرٹ آئن سٹائنAlbert Einstein کا بھی کہنا تھا کہ سائنسی تحقیق کے دوران سائنسدانوں کو ایسے تجربات ہوتے ہیں جنہیں روحانی تجربات کہا جا سکتا ہے لیکن ایسے تجربات کا کسی مذہب یا خدا سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسے تجربات انسانی تجربات ہیں جو ایک شاعر کو بھی ہو سکتے ہیں ایک ادیب کو بھی، ایک صوفی کو بھی ہو سکتے ہیں ایک سائنسدان کو بھی۔ جب کوئی انسان جو روزمرہ کے مسائل کو حل کرنے کے لیے بائیں دماغ Left Brain سے کام لے رہا ہوتا ہے جب کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے اور کسی

مسئلے پر یکسوئی سے سوچتا ہے تو اس کا اپنے دائیں دماغ Right Brain سے رشتہ جڑ جاتا ہے تو اسے ایسے تجربات ہوتے ہیں جنہیں ہم روحانی اور تخلیقی تجربات Spiritual and Creative Encounters کہہ سکتے ہیں۔ یہ تجربات شاعروں' ادیبوں' دانشوروں' صوفیوں اور سائنسدانوں کو زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ وہ زندگی کے بارے میں زیادہ غور وفکر کرتے ہیں اور انسانی مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سوچ و بچار سے ان کی شعور کی اعلیٰ سطح تک رسائی ہو جاتی ہے جس تک عام انسانوں کی رسائی مشکل ہوتی ہے۔ اسی لیے مشہور تاریخ داں آرنلڈ ٹوئنبی Arnold Toynbee نے کہا تھا کہ ہر قوم کی ایک اقلیت تخلیقی لوگوں کی ہوتی ہے (Creative Personalities) ہمیں اس اقلیت کا خاص خیال رکھنا چاہیے کیونکہ انسانیت کی اکثریت کے مستقبل کا دارومدار اسی اقلیت پہ ہے۔ یہ اقلیت اپنی تخلیقی سوچ سے انسانیت کے ارتقا میں اس کی رہنمائی کرتی ہے۔

O

References

1. Sohail K ...From Islam to Secular Humanism Abbeyfield Publishers Canada 2001
2. Maitreya ...Gospel of Peace Universal Way Publications Canada 1988
3. Jayakar Papal ...Krishnamurti...A Biography Harper and Rowe Publishers New York 1985
4. Arieti Silvano...Interpretation fo Schizophrenia Basic Books New York USA 1974
5. White John...What is Enlightenment? Jeremy Tarcher Inc Los Angeles USA 1984
6. Fadiman James and Frager Robert ...Essential Sufism Castle Books New Jersey USA 1997
7. Gordon James ...The Golden Guru...the Strange Journey of Bhagwan Shree rajneesh Stephen Greene Books USA 1987
8. Buckman Robert...Can We Be Good Without God? Viking Books Canada 2000
9. Internet Wikipedia Temporal Lobe Epilepsy
10. Jaynes Julian...The Origin of Consciousness in the Breakdown of the Bicameral Mind Mariner Books 1990
11. Maslow Abraham ...Religions, Values and Peak Experiences Penguin Books England 1970
12. Arieti Silvano...Creativity: The Magic Synthesis Basic Books Inc Publisher New York 1976

سائنس اور روحانیات۔۔ڈاکٹر جل ٹیلر کی کہانی

پچھلے دنوں میں نے ڈاکٹر جل ٹیلر کی کتاب مائی سٹروک آف ان سائٹ My stroke of insight by Dr Jill Taylor پڑھی جو سائنس اور روحانیت کے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں ایک دماغ کی ماہر ڈاکٹر اپنے روحانی تجربات کے بارے میں سائنسی نقطہِ نظر سے گفتگو کرتی ہیں۔ ڈاکٹر جل ٹیلر جو یونیورسٹی میں دماغ پر تحقیق کر رہی تھیں خود ایک صبح سٹروکstroke کا شکار ہو گئیں اور چند ہی گھنٹوں میں اتنی بیمار ہو گئیں کہ ہسپتال میں داخل ہو گئیں۔ ایکس رےxray نے بتایا کہ ان کے دماغ کا بایاں حصہ مفلوج ہو گیا ہے۔ ان کا دماغ کا دورہ اتنا شدید تھا کہ انہیں شفایاب ہونے میں کئی سال لگے۔ ان چند سالوں میں ان کے ڈاکٹروں' نرسوں اور اہلِ خانہ نے ان کا خاص خیال رکھا۔ ان کی والدہ نے دن رات ان کی خدمت کی۔ آخر وہ شفایاب ہو گئیں۔ شفایاب ہونے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بیمار ہونے اور شفایاب ہونے کے بارے میں ایک کتاب لکھیں۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنی کہانی تفصیل سے لکھی ہے۔

ڈاکٹر جل ٹیلر کی بیماری اور شفایابی کی ایک اہم بات یہ تھی کہ اگرچہ ان کا بایاں دماغ مفلوج ہو گیا تھا' جس کی وجہ سے وہ نہ تو بات چیت کر سکتی تھیں اور نہ چل پھر سکتی تھیں لیکن ان کا دایاں دماغ کام کر رہا تھا۔ چونکہ دائیں دماغ کا تعلق روحانی تجربات spiritual encounters سے ہے اس لیے ہمیں ڈاکٹر جل ٹیلر کی کہانی روحانیات کو سائنسی نکتہِ نگاہ سے وسمجھنے میں مدد کرتی ہے۔

ڈاکٹر جل ٹیلر ایک سائنسدان ہیں ان کا کسی مذہبی مکتبہِ فکر یا روحانی گروہ سے

کوئی تعلق نہیں۔ ان کے مشاہدات اور تجربات ایک پادری اور ایک دہریہ دونوں کے لیے قابلِ قبول ہیں کیونکہ وہ کسی بھی مذہبی نظریے کے پرچارک نہیں ہیں۔ وہ ہمیں بتاتی ہیں کہ ان کے دائیں دماغ کے تجربات انسانی روحانیات کے راز جاننے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر جل ٹیلر چونکہ پیشے کے لحاظ سے ایک استاد ہیں اس لیے وہ اپنے تجربات کو اس طرح بیان کرتی ہیں کہ قاری انہیں پوری طرح سمجھ سکے۔ میں ان کی کتاب میں بیان کیے ہوئے روحانیات کے چند رازوں کو اس مضمون میں بیان کروں گا تاکہ آپ کو اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

ڈاکٹر جل ٹیلر لکھتی ہیں کہ ہر انسان اپنے بائیں دماغ کی وجہ سے اپنی ذات کو کائنات سے علیحدہ سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کائنات کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اس سے جدا ہے۔ جب ڈاکٹر جل ٹیلر کا بایاں دماغ مفلوج ہوا تو انہیں یہ تجربہ ہوا کہ ان کی ذات کائنات میں اور کائنات ان کی ذات میں تحلیل ہوگئی ہے۔ وہ کائنات میں ضم ہو گئیں۔ بعض ماہرین اس تجربے کو قطرے کا سمندر میں ضم ہو جانا oceanic feeling کہتے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں 'اس صبح جب مجھے سٹروک ہوا تو چند ہی گھنٹوں میں میرے شعور میں ایک حیرت انگیز تبدیلی آئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اور کائنات ایک ہو گئے ہوں۔ یہ ایک غیر معمولی تجربہ تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اس روحانی تجربے کا تعلق ہمارے دائیں دماغ کے ساتھ ہے۔'

ہمیں سنتوں' سادھوؤں اور صوفیوں کی سوانح عمریوں میں ایسے تجربات کا ذکر ملتا ہے کہ برسوں کی ریاضت اور تپسیا کے بعد وہ روحانیت کی اس منزل پر پہنچتے ہیں جہاں انہیں احساس ہوتا ہے کہ ان کی ذات اور کائنات' جسے بعض انسان خدا' بھگوان یا یزداں کا نام دیتے ہیں' ایک ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر جل ٹیلر لکھتی ہیں کہ کائنات میں ضم ہونے کا تجربہ بہت ہی پرسکون تجربہ تھا۔

بائیں دماغ کے مفلوج ہونے کا اثر وقت کے تجربے پر بھی پڑتا ہے۔ انسان کا بایاں دماغ انسان کو ماضی' حال اور مستقبل میں فرق بتاتا ہے۔ ڈاکٹر جل ٹیلر کا جب بایاں دماغ مفلوج ہو گیا تو گزشتہ کل' آج اور آئندہ کل کا فرق ختم ہو گیا۔ وہ ایک ازلی و ابدی لمحہ موجود eternal now کا حصہ بن گئیں۔ عارف عبدالمتین کا شعر ہے

وقت اک بحرِ بے پایاں ہے کیسا ازل اور کیسا ابد
وقت کے ناقص پیمانے ہیں ماضی، مستقبل اور حال

ڈاکٹر جل ٹیلر لکھتی ہیں' ہمارے دائیں دماغ کے لیے حال کے علاوہ کوئی اور وقت حقیقت نہیں رکھتا۔ اس کے لیے ہر لحہ ازلی و ابدی لمحہِ موجود ہے اور پرسکون ہے۔'

اس تجربے کے بارے میں وہ کہتی ہیں' میں کوئی مذہبی عورت نہیں ہوں۔ میں نے کبھی روحانیت کی منزلیں طے کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن جب میری ذات کائنات کا حصہ بن گئی اور میں ماضی، حال اور مستقبل سے بے نیاز لمحہِ موجود میں زندہ رہنے لگی تو مجھے احساس ہوا کہ میں اس تجربے سے گزر رہی ہوں جسے بدھسٹ نروانا کہتے ہیں'

ڈاکٹر جل ٹیلر کو نروانا تو حاصل ہو گیا اور وہ پرسکون بھی ہو گئیں لیکن چونکہ ان کا بایاں دماغ مفلوج ہو چکا تھا اس لیے وہ کئی سالوں تک اپنے ڈاکٹروں، نرسوں اور اہلِ خانہ کے رحم و کرم پر رہیں۔ اگر وہ ان کا خیال اور علاج نہ کرتے تو وہ زندہ نہ رہ سکتیں۔

بائیں دماغ کا ایک اور کام یہ ہے کہ وہ ہمیں سماج سے جوڑے رکھتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارا خاندان اور ہمارا معاشرہ ہم سے کیا توقعات رکھتا ہے۔ وہ ہمیں نیکی بدی، خیر و شر کا فرق بتاتا ہے۔ جب ڈاکٹر جل ٹیلر کا بایاں دماغ مفلوج ہوا تو وہ خیر و شر کے جھگڑوں سے بالاتر ہو گئیں۔ انہیں اپنی ذات اور دوسروں کی ذات نیک اور خوبصورت دکھائی دینے لگے۔ ان کے لیے اپنی ذات سے اور ساری انسانیت سے محبت کرنا آسان ہو گیا۔ انہیں اندازہ ہوا کہ وہ سب لوگ جو اپنے دائیں دماغ کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں وہ

---پرسکون ہوتے ہیں
---دوسرے انسانوں کو ان کی خوبیوں خامیوں سمیت قبول کرتے ہیں
---گناہ و ثواب کے جھگڑوں سے بالاتر ہو جاتے ہیں
---لمحہِ موجود میں زندہ رہتے ہیں

اور

---اپنی ذات کو ساری انسانیت اور کائنات کی اکائی کا حصہ سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر جل ٹیلر کہتی ہیں کہ مختلف مذاہب کی روحانی روایات کی یہی کوشش رہی ہے کہ انسان اپنی ریاضت سے اپنے دائیں دماغ کے ساتھ رشتہ جوڑیں تا کہ پرسکون

زندگی گزار سکیں۔ سنت سادھو اور صوفی تو برسوں کی ریاضت کے بعد ان روحانی تجربات سے روشناس ہوتے ہیں لیکن ڈاکٹر جل ٹیلر کو ایسے تجربات ان کی بیماری کی وجہ سے ہوئے۔ ان کی بیماری نے ان کا ایسے تجربات سے تعارف کروایا جو عام حالات میں ممکن نہ ہوتا۔

چند سالوں کی بیماری کے بعد جب ڈاکٹر جل ٹیلر صحتیاب ہو گئیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ بائیں دماغ کے کام کرنے کے باوجود وہ اپنے دائیں دماغ سے جڑی رہیں گی تا کہ پرسکون زندگی گزار سکیں۔ ان کا ہم سب کو مشورہ ہے کہ بایاں دماغ ہمیں اپنے روزمرہ کے مسائل کو حل کرنے میں مدد کرتا ہے لیکن دایاں دماغ ہمیں پرسکون زندگی گزارنے میں مدد کرتا ہے۔ اس لیے ان تمام لوگوں کو جو ایک صحتمند اور پرسکون زندگی گزارنا چاہتے ہیں، چاہیے کہ وہ اپنے بائیں اور دائیں دماغ دونوں سے رشتہ قائم رکھیں تا کہ ایک متوازن زندگی گزار سکیں۔ دائیں دماغ سے رشتہ جوڑنے کے لیے اور پرسکون زندگی گزارنے کے لیے لازم نہیں کہ ہم کسی خدا یا مذہب سے بھی رشتہ جوڑیں کیونکہ روحانیت انسانیت کا اٹوٹ حصہ ہے۔

Spirituality is part of our humanity

انسانی ارتقا میں صوفیوں، فنکاروں اور سائنسدانوں کا کردار

تخلیق: ڈاکٹر خالد سہیل

ترجمہ۔ عظمیٰ محمود

جب ہم انسانی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ انسانی ارتقا کا عمل صدیوں پر محیط ہے۔ ہر نسل میں ایک اکثریتmajority ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے سماج کی روایتوں پر نہ صرف اندھا ایمان لاتے ہیں بلکہ ان پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں۔ ایسے رسم و رواج کچھ ایسے مذاہب کو جنم دیتے ہیں جن کے رہنما اپنے پیروکاروں میں بہت اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ ایسے رہنما عوام الناس کی ذاتی اور معاشرتی زندگی پر حکومت کرتے ہیں۔ ان رہنماؤں میں سے کچھ اس طاقت کے نشے میں اتنے مدہوش ہو جاتے ہیں کہ اپنے پیروکاروں کو سماجی، مذہبی، معاشی اور سیاسی طور پر گمراہ کرتے ہیں۔ جیسے جیسے یہ مذاہب اور روایات اداراتی صورت اختیار کرتے چلے جاتے ہیں ان کے اختیارات اور طاقت کا استعمال بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن ہر نسل، ہر قوم اور ہر عہد میں ایک اقلیتminority ایسی بھی ہوتی ہے جو روایت کو چیلنج کرتی ہے۔ اس اقلیت میں اس دور کے صوفی، فنکار اور سائنسدان شامل ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ خود پرست مذہبی رہنماؤں اور ظالم روایتوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور قربانیاں دیتے ہیں۔

ہر دور میں ایسے روحانی لوگ پیدا ہوئے ہیں جو سنت' سادھو' درویش اور صوفی کہلائے ہیں۔ یہ لوگ روایت کی شاہراہ پر چلنے کی بجائے اپنے من کی پگڈنڈی پر چلتے رہے ہیں۔ انہوں نے جب غیر منصفانہ راتیوں کو چیلنج کیا تو اصحابِ بست و کشاد نے انہیں بہت اذیتیں دیں۔ کچھ کو جیل میں ڈالا گیا اور کچھ کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ ان لوگوں نے اپنے آدرش کے لیے بہت سی قربانیاں دیں۔ مشہور صوفی منصور حلاج ' ان الحق' کہنے پر سولی پر چڑھا دیے گئے۔

ان خدا ترس صوفیوں' سنتوں' سادھوؤں اور درویشوں سے روایتی مولوی' پادری' پنڈت اور ریبائی بہت خوفزدہ رہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے علاقے میں مذہبی ٹھیکیدار بنے رہتے ہیں۔ عوام الناس نے اپنے اپنے علاقوں کے صوفیوں اور درویشوں سے محبت بھی کی اور ان کا احترام بھی کیا۔ ان صوفیا نے سادگی کی زندگی اختیار کی اور خلوصِ دل سے خدمتِ خلق کی۔ ان صوفیا نے روایتی اعتقادات کی بجائے انسان دوستی کی روایت کو اپنایا۔ بہت سے سنت' سادھو' صوفی اور درویش بدھا کا بہت احترام کرتے ہیں جنہوں نے آج سے ۲۵۰۰ برس پیشتر فرمایا تھا

--کسی بات پر ایمان نہ لاؤ کیونکہ وہ بات کسی نام نہاد بزرگ نے کہی ہے

--کسی بات پر ایمان نہ لاؤ کیونکہ وہ بات ازمنہ قدیم کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔

--کسی بات پر ایمان نہ لاؤ کیونکہ کوئی اور اس پر ایمان رکھتا ہے

صرف اس بات پر ایمان لاؤ جسے تم نے ذاتی طور پر جانچا اور پرکھا ہے اور وہ سچائی اور حقیقت پر مبنی ہے۔

بیسویں صدی کے مشہور سادھو جے کرشنامورتی j Krishnamurti کا کہنا ہے

Truth is a pathless land

سنتوں' سادھوؤں' صوفیوں اور درویشوں کے ساتھ ساتھ ہر دور میں شاعر' ادیب اور فنکار بھی پیدا ہوتے ہیں۔ جو فنونِ لطیفہ تخلیق کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے شعروں' ناولوں اور ڈراموں میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں جو اعلیٰ تخیل اور غیر روایتی ادراک سے

لبریز ہوتے ہیں۔ ان فنکاروں نے ہمیں سکھایا کہ مذہبی صحائف علاقائی لوک ورثہ کا حصہ تھے۔ فنکار عوام الناس سے جذباتی طور پر منسلک ہوتے ہیں۔ روایتی مولوی اور پادری ربائی اور پنڈت سنتوں، سادھوؤں اور صوفیوں کے ساتھ ساتھ فنکاروں سے بھی پریشان رہتے ہیں کیونکہ یہ فنکار ان کی روایتی اخلاقیات کو چیلنج کرتے ہیں۔

فنکار اپنی تخلیقات سے ہمارے دائیں دماغ کی نشوونما اور پرورش کرتے ہیں۔ خواہ وہ شیکسپیئر Shakespeare اور ابسن Ibsen کے ڈرامے ہوں، پکاسو Picasso اور وین گو Van Gogh کی مصوری کے شاہکار ہوں یا ورجینیا وولف Virginia Woolf یا کافکا kafka کے افسانے ہوں یا غالب اور نرودا Neruda کی شاعری ہو یہ سب فنکار اپنی تخلیقات سے ہماری حسِ جمالیت سنوارتے ہیں۔ بنی نوعِ انسان کے ارتقا میں ان فنکاروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

بعض فنکار شاعر بھی تھے اور صوفی اور سادھو بھی۔ ان فنکاروں میں بھگت کبیر، بابا بلھے شاہ، شیخ سعدی، مولانا رومی، ولیم بلیک اور والٹ وٹمین شامل ہیں۔

پچھلی چند صدیوں میں فنونِ لطیفہ کے ساتھ ساتھ فلسفہ اور سائنس نے بھی ترقی کی ہے۔ سائنسدانوں نے نہ صرف مذہبی رہنماؤں کو بلکہ سنتوں، سادھوؤں کو بھی چیلنج کیا۔ سائنسدان کسی ایسی بات کو نہیں مانتے جسکا عقلی اور منطقی ثبوت موجود نہ ہو۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ انسانی تجربات دو طرح کے ہوتے ہیں۔

داخلی حقائق Subjective Truths

خارجی حقائق Objective Truths

سائنسدان کہتے ہیں کہ ہر انسان کو اپنے داخلی حقائق کو ماننے کا حق ہے لیکن ہم صرف ان حقائق کو معروضی طور پر مانیں گے جن کے حق میں ثبوت موجود ہوں گے۔

پچھلی چند صدیوں میں مختلف سائنسدانوں اور فلسفیوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کی اور اپنی تحقیق سے انسانی علوم میں اضافہ کیا۔

علم حیاتیات Biology میں چارلز ڈارون Charles Darwin نے

علمِ نفسیات Psychology میں سگمنڈ فرائڈ Sigmund Freud نے

علمِ سماجیات Sociology میں کارل مارکس Karl Marx نے

علمِ افلاکیات Cosmology میں سٹیون ہاکنگ Stephen Hawking نے

انسانی علوم میں گرانقدر اضافے کیے۔

جب ہم پچھلی چند صدیوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ صوفیا اور فنکاروں نے مذہبی روایات پر اندر سے اور فلاسفروں اور سائنسدانوں نے ان روایات پر باہر سے کاری ضرب لگائی۔ جہاں صوفیوں اور فنکاروں نے انسان کے دائیں دماغ کی نشوونما میں مدد کی تو فلاسفروں اور سائنسدانوں نے بائیں دماغ کی آبیاری کی۔ بہت سے فلاسفروں اور سائنسدانوں نے اپنی عمر زندگی کی بلندیوں اور گہرائیوں کے راز جاننے میں صرف کر دی۔

جوں جوں فلسفے اور سائنس کے علوم نے ترقی کی وہیں وہیں ساری دنیا میں سیکولر نقطۂ نظر مقبول ہوا۔ چند فلسفیوں نے روحانی تجربات کا مطالعہ سائنس اور نفسیات کی روشنی میں کیا اور یہ ثابت کیا کہ کسی بھی انسان کے لیے روحانی تجربات کے لیے ان کا کسی خدا یا مذہب پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ یہ روحانی تجربات ایک دہریے کو بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ روحانیت انسانیت کا حصہ ہے۔ سیکولر فلسفیوں اور سائنسدانوں کا موقف ہے کہ مذہب انسانیت کا ماضی تھا سائنس اس کا مستقبل ہے۔ سگمنڈ فرائڈ کا کہنا تھا کہ جوں جوں سائنس کا دائرۂ اختیار وسیع ہوتا جائے گا، مذہب کا دائرۂ اختیار تنگ ہوتا جائے گا۔

چاہے وہ صوفی ہوں یا فنکار، فلسفی ہوں یا سائنسدان وہ سب ایک تخلیقی اقلیت Creative Minority کا حصہ ہوتے ہیں جو ہر دور میں روایتی اکثریت Traditional Majority کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ایک مشہور تاریخ دان آرنلڈ ٹوئنبی Arnold Toynbee نے لکھا ہے' تخلیقی سوچ رکھنے والوں کو ایک مناسب موقع دینا کسی بھی معاشرے میں زندگی اور موت کا معاملہ بن جاتا ہے۔ اسی لیے یہ بات اہم ہے کہ آبادی

کے چھوٹے سے طبقے کی غیر معمولی تخلیقی اقلیت ہی بنی نوعِ انسان کا اہم خزانہ ہے'

To give a fair chance to potential creativity is a matter of life and death of any society. This is all important because the outstanding creative ability of a small percentage of the population is mankind's ultimate asset" Arnold Toynbee

O

'میری تخلیقات دکھی انسانیت کے نام میرے محبت نامے ہیں'

گوہر تاج کے خالد سہیل سے بیس سوالات

محترمہ گوہر تاج صاحبہ!

اس سے پہلے کہ میں آپ کے سوالات کے جوابات لکھوں میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے بڑی محنت سے یہ سوال تیار کیے ہیں۔ آٹھ سال پیشتر بھی جب آپ نے میرا پہلا انٹرویو لیا تھا اس وقت بھی مجھے احساس ہوا تھا کہ آپ نے انٹرویو لینے سے پہلے میری ویب سائٹ پر جا کر میری تخلیقات کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا تھا۔ آپ کے اس ہوم ورک home work سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ اس ہوم ورک سے مجھے اندازہ ہوا کہ آپ سماجی مسائل کے بارے میں سنجیدہ رویہ رکھتی ہیں اور اپنے قارئین کا سماجی شعور بڑھانے کی حتی المقدور کوشش کرتی ہیں۔ آپ کے اس رویے سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم دونوں ادبی دوست بن سکتے ہیں۔ آپ کے ساتھ

مل کر جو میں نے تخلیقی کام کیے ہیں اور ہم نے مل کر جو کتابیں چھاپی ہیں مجھے ان سب پر فخر ہے۔آپ کئی حوالوں سے میرے تخلیقی کاموں کے لیے inspiration رہی ہیں جس کا میں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔اب میں آپ کے سوالوں کی طرف آتا ہوں۔

آپ کا تخلیقی ہم سفر

خالد سہیل

اکتوبر ۲۰۱۶ء

ڈاکٹر خالد سہیل سے کچھ سوالات

خالد سہیل صاحب! کچھ آٹھ سال قبل آپ سے پہلی بار گفتگو مہاجروں کی ذہنی صحت کے حوالے سے ہوئی تھی (جو اردو ٹائمز کے لیے انٹرویو تھا) لیکن آپ کی شخصیت کی کئی جہتیں ہیں۔آپ نفسیاتی امراض کے ماہر معالج ہی نہیں بلکہ شاعر ادیب افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ نفسیاتی اور سماجی موضوعات پر بھی تواتر سے لکھتے ہیں لہٰذا میں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ آپ سے دوسرے موضوعات پر بھی گفتگو کی جائے۔

گوہر تاج

گوہر تاج۔ آپ یہ بتائیے کی آپ کی ادبی، تخلیقی، علمی اور کسی حد تک سیاسی بالیدگی میں آپ کے خاندانی پس منظر اور ماحول کا کیا کردار ہے؟

خالد سہیل: مجھے اپنے والدین سے دو رویے وراثت میں ملے۔میری والدہ عائشہ قاسم ایک حقیقت پسند Realist خاتون تھیں جبکہ میرے والد عبدالباسط ایک مثالیت پسند Idealist انسان تھے۔میری شخصیت میں ان دونوں رویوں

کا امتزاج ہے۔میرا ننھیال روایتیTraditional جبکہ میرا ددھیال غیر روایتی اور تخلیقیCreative تھا۔میرے داداعبدالمجید نے اپنے دونوں بیٹوں اور دونوں بیٹیوں کو۱۹۴۰ء کی دہائی میں گریجویشن کروایا تھا۔ میرے والد ایک ریاضی دان تھے جبکہ میرے چچا عارف عبدالمتین اردو اور پنجابی کے شاعر' ادیب اور دانشور تھے۔میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔انہوں نے مجھے شاعر اور ادیب بننے اور سماجی' ادبی اور سیاسی شعور حاصل کرنے میں میری بہت حوصلہ افزائی کی۔

گوہر تاج۔ آپ کے یہاں نوجوانی سے ہی بغاوت کا رویہ جاری ہے۔کہیں اس میں پشاور جیسی قدامت پسند اور روایتی جگہ میں تربیت کا ہاتھ تو نہیں ہے؟

خالد سہیل: یہ بات تو درست ہے کہ پشاور اور صوبہ سرحد کا ماحول روایتی اور قدامت پسند تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہر شاعر اور ادیب' سائنسدان اور فلسفی اندر سے باغی ہوتا ہے اور غیر منصفانہ روایتوں کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔میرے شاعر چچا عارف عبدالمتین نے مجھے بیس برس کی عمر میں بتایا تھا کہ ہر معاشرے اور تاریخ کے ہر دور میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ اکثریت جو روایت کی شاہراہ پر اور اقلیت جو من کی پگڈنڈی پر چلتی ہے۔ان کا کہنا تھا کہ میں اس اقلیت کا حصہ ہوں۔ یہی وہ اقلیت ہے جو روایت کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ یہ اقلیت معاشرے میں علم و آگہی کی شمع روشن کرتی ہے' ظلم' جبر اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتی ہے اور امن اور آشتی کے خواب دیکھتی ہے۔

گوہر تاج: آپ نے نفسیات کا انتخاب کیوں کیا؟

خالد سہیل: میری والدہ کا خواب تھا کہ میں ایک ڈاکٹر بنوں جب کہ میرا خواب تھا کہ میں ایک شاعر اور فلاسفر بنوں۔ جب میں ڈاکٹر بن گیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک دوراہے پر پایا۔آخر میں نے سوچا کہ اگر میں ایک ماہر نفسیات بن جاؤں تو میرے ڈاکٹر اور فلاسفر بننے کے خواب یکجا ہو جائیں

گے۔

نفسیات میں میری خصوصی دلچسپی کی دو وجوہات اور بھی ہیں۔جب میں دس سال کا تھا تو میرے والد عبدالباسط ایک نفسیاتی بحران کا شکار ہوئے۔ ایک سال کے بعد جب وہ صحتیاب ہوئے تو وہ ایک صوفی بن گئے۔میرا خیال ہے کہ بچپن کے اس تجربے نے لاشعوری طور پر مجھے ماہر نفسیات بننے کی تحریک دی ہوگی۔

نوجوانی کے دور میں جب میری بہت سی شامیں لائبریری میں گزریں اور میں نے سینکڑوں کتابیں پڑھیں اس دور میں میں نے ایک کتاب پڑھی جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کتاب کا نام 'تحلیلِ نفسی' تھا۔اس کتاب نے مجھے انسانی ذہن کی گتھیاں سلجھانے کی تحریک دی۔ میری نگاہ میں یہ وہ عوامل ہیں جنہوں نے مجھے نفسیات کا طالبعلم اور بعد میں ماہرِ نفسیات بننے میں اہم کردار کیا۔

گوہر تاج۔ آپ کی تحریروں میں امن پسندی کا پرچار قابلِ ستائش ہے لیکن یہ آپ ایک امن پسند ملک میں رہتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔ستر کی دہائی میں تعلیم کے بعد آپ نے باہر کا رخ اختیار کیا جبکہ آپ سماج کی تبدیلی اور امن کی ملکی جدوجہد میں حصہ لے سکتے تھے۔آپ نے وطن میں رہنے کی بجائے ملک چھوڑنے کو ترجیح دی۔ کیا ہم اس کو مشکل حالات سے فرار نہیں کہیں گے؟

خالد سہیل۔ پشاور میں جب میں نے نفسیات میں تخصص حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ آپ ہر شعبے میں تخصص حاصل کر سکتے ہیں سوائے نفسیات کے۔چنانچہ پہلے میں ایران گیا اور پھر میں نے نفسیات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ساری دنیا کی یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے درخواستیں دیں۔چند ماہ کی کوشش کے بعد مجھے آئرلینڈ' نیوزی لینڈ اور

نیوفن لینڈ میں داخلہ مل گیا۔ میں نے اپنی پروفیسر ڈاکٹر شمیم مجید سے مشورہ کیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ کینیڈا جا کر فیلوشپ حاصل کروں کیونکہ کینیڈا کی ڈگری ساری دنیا میں زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ چنانچہ کینیڈا آنے اور رہنے میں نفسیات کی تعلیم کا اہم کردار ہے۔ پاکستان میں آج بھی لوگ پیروں فقیروں کے پاس جاتے ہیں ماہرین نفسیات کے پاس نہیں۔ اس لیے آپ کے مشورے سے میں نے نفسیات میں اردو میں کتابیں لکھی ہیں تا کہ معاشرے میں نفسیات کی تعلیم اور آگہی بڑھائی جائے۔

جہاں تک امن کا تعلق ہے تو میں اسے ایک عالمی مسئلہ سمجھتا ہوں۔ چاہے پہلی جنگِ عظیم ہو یا دوسری جنگِ عظیم، مشرقِ وسطیٰ کی جنگ ہو یا war on terror ہو، یہ عالمی جنگیں ہیں جس میں پاکستان نے اپنی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے اہم کردار کیا ہے۔

پاکستان افغانستان کا ہمسایہ ہے۔ افغانستان پر روس حملہ آور ہوا تھا جس کے جواب میں امریکہ نے کمیونزم کو شکست دینے کے لیے پاکستان کو استعمال کیا۔ میں نے عالمی امن کے حوالے سے دو کتابیں لکھی ہیں

Prophets of Violence, Prophets of Peace

From Holy War to Global Peace

ان کتابوں میں میں نے ان رہنماؤں Leaders اور پیروکاروں Followers کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے جو امن یا تشدد کی تحریک میں شامل ہوتے ہیں، اپنے آدرش کے لیے جان دیتے ہیں اور پھر جان لیتے ہیں۔ اپنے مطالعے اور تجزیے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بیسویں صدی میں دو اہم تحریکیں چلیں۔ ایک تحریک کمیونزم کی تھی جو انصاف قائم کرنے کے لیے مسلح جدوجہد کے حق میں تھی۔ اس تحریک کے بانی ولادمیر لینن تھے جنہوں نے روس میں انقلاب لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ کارل

مارکس سے متاثر تھے۔روس کے انقلاب کے بعد چین میں ماؤزے تنگ' ویتنام میں ہوچی منہ' کیوبا میں چے گوارا اور فیڈرل کاسترو اسی تحریک کا حصہ تھے۔

جس دور میں روس میں مسلح جدوجہد کی بانی ولادمیر لینن زندہ تھے اسی دور میں روس میں امن پسند تحریک کے بانی لیو ٹالسٹائی بھی زندہ تھے۔ٹولسٹائی کی امن کی تحریک سے متاثر ہونے والوں میں ہندوستان کے موہنداس گاندھی' امریکہ کے مارٹن لوتھر کنگ جونیر اور تبت کے دالائے لامہ بھی شامل تھے۔

میں اس طویل جواب سے یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہم سب دنیا کے کسی کونے میں زندہ رہ کر بھی عالمی امن کی تحریک سے جڑ سکتے ہیں۔اب دنیا ایک عالمی گاؤں بن گئی ہے۔

گوہر تاج۔ آپ ایک نفسیاتی معالج ہیں اور ساتھ میں ادیب بھی۔کیا آپ کے خیال میں ادیب نفسیات سے تعلق رکھتا ہوتو عام ادیبوں سے بہتر ادب تخلیق کر سکتا ہے؟

خالد سہیل: ہر جینون ادیب ایک ماہر نفسیات ہوتا ہے لیکن وہ انسانی نفسیات کا مطالعہ زندگی سے کرتا ہے درسی کتابوں سے نہیں۔ چاہے وہ شیکسپیر ہوں یا کافکا' منٹو ہوں یا عصمت چغتائی ان کی انسانوں کی انفرادی اور معاشرتی نفسیات پر گہری نظر تھی۔میری خوش قسمتی کہ مجھے ادب کا بھی شوق تھا اور نفسیات کا بھی۔ مجھے اپنے مریضوں کے علاج کے دوران انسانی نفسیات کو ایک اور نگاہ سے دیکھنے کا موقع ملا۔میری زندگی میں میرے اندر کے ادیب اور ماہرِ نفسیات نے ایک دوسرے کی مدد بھی کی اور حوصلہ افزائی بھی۔

گوہر تاج: کیا ادب سے سماجی انقلاب ممکن ہے؟ انجمن ترقی پسند ادب کی تحریک نے

بھرپور اور سماج سے جڑا ہوا ادب تخلیق کیا۔ اس کے زوال کے کچھ عوامل بیان کریں؟

خالد سہیل: کسی بھی معاشرے میں انقلاب دو سطحوں پر ہوتا ہے۔ نظریاتی سطح پر اور سیاسی سطح پر۔ نظریاتی سطح پر انقلاب شاعر، ادیب اور دانشور لاتے ہیں۔ وہ لوگوں میں بیداری پیدا کرتے ہیں۔ انہیں بہتر انسان بننے اور بہتر معاشرہ تخلیق کرنے کا خواب دکھاتے ہیں جبکہ سیاسی لیڈر اور کارکن اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرتے ہیں اور ایک بہتر معاشرہ قائم کرتے ہیں۔ کارل مارکس نے نظریاتی سطح پر اور فیڈرل کاسترو نے سیاسی سطح پر انقلاب قائم کیا۔ یہ علیحدہ بات کہ لینن کی طرح بعض لیڈر نظریاتی اور سیاسی دونوں سطحوں پر انقلاب لاتے ہیں۔

جہاں تک ترقی پسند تحریک کا تعلق ہے، جس کے بارے میں پچھلے دنوں میں نے اپنے ترقی پسند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک کتاب چھاپی ہے جس کا نام

Progressive Ideas and Ideals in Urdu Literature ہے

اس میں ہم نے سجاد ظہیر، سبطِ حسن، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، پریم چند اور کئی اور ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کی تخلیقات کے انگریزی تراجم چھاپے ہیں۔

میری نگاہ میں تحریک اور نظریہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ ہندوستان میں ترقی پسند تحریک چند مخصوص سماجی اور سیاسی حالات کی وجہ سے وجود میں آئی تھی اور ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے بعد حالات بدلنے سے ختم ہو گئی۔ میں نے ۱۹۸۵ء میں لندن میں اس تحریک کی پچاسویں سالگرہ کی celebration میں حصہ لیا تھا۔ ترقی پسند ادب تو آج بھی لکھا جا رہا ہے۔

کہیں عورتوں کے مسائل کے بارے میں

وکہیں کالوں کے مسائل کے بارے میں
کہیں گے اور لیسبین لوگوں کے مسائل کے بارے میں

اور

کہیں تشدد کے خلاف اور امن کے حق میں لکھا جا رہا ہے۔ یہ سب ترقی پسند ادب کا حصہ ہے۔ میری نگاہ میں ہر دور میں ادیب اور شاعر ترقی پسند ادب تخلیق کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ بعض ادیب وہ ادب ذاتی حوالے سے اور بعض کسی سیاسی تحریک کا حصہ بن کر تخلیق کرتے ہیں۔

گوہر تاج: کیا ادیب کو طبقاتی جنگ میں قلم کے سپاہی کا کردار نبھانا چاہیے یا اس کا کوئی اور ہی منصب ہے؟

خالد سہیل: یہ فیصلہ ہر دور اور ہر معاشرے کے ادیب خود کرتے ہیں۔
جو ادیب اپنے خوابوں کا تخلیقی اظہار اپنے ادب میں کرتے ہیں وہ فنکار ہوتے ہیں اور جو ادیب فنکار ہی نہیں سیاسی کارکن بھی ہوتے ہیں وہ سیاسی تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں۔
بعض ادیب صرف خواب دکھاتے ہیں اور بعض ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر بھی کرتے ہیں۔ یہ ان ادیبوں کا انفرادی اور اجتماعی فیصلہ ہے۔ ہر ادیب آزاد ہوتا ہے کہ وہ اپنے تخلیقی potential کا اظہار کس طرح کرنا چاہتا ہے۔

گوہر تاج: آپ کی مادری زبان پنجابی' گھر سے باہر پشاور میں پشتو اور تعلیمی ادارے میں انگریزی' جبکہ آپ نے اردو میں لکھنے کا آغاز کیا۔ کیوں؟ مشکل نہیں ہوئی؟

خالد سہیل: میں نے جب بچپن میں بچوں کے رسالے پڑھے اور نوجوانی میں منٹو' عصمت' فراز' فیض اور ساحر کی تخلیقات پڑھیں تو میں اردو کے عشق میں

گرفتار ہو گیا اور اس زبان میں لکھنا شروع کر دیا۔ یہ عشق آج تک جاری ہے۔ جہاں تک پنجابی کا تعلق ہے بدقسمتی سے میری والدہ نے مجھے اپنی ماں بولی پنجابی میں لکھنا پڑھنا نہیں سکھایا ان کا خیال تھا کہ اردو اور انگریزی مجھے ڈاکٹر بننے میں مدد کریں گے۔

گوہر تاج: ایک عرصے تک اردو میں لکھنے کے بعد اب آپ انگریزی میں لکھ رہے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ تاہم اسکے بعد حال ہی میں آپ کی دو کتابیں اردو میں بھی شائع ہوئی ہیں اس کی وجہ بھی بیان کر دیں؟

خالد سہیل: انگریزی میں لکھنے کا فیصلہ شعوری نہیں تھا۔ چونکہ میں کینیڈا میں رہائش پزیر ہوں اور سارا دن کنیڈین مریضوں کا انگریزی میں علاج کرتا ہوں تو آہستہ آہستہ انگریزی میرے لاشعور کا حصہ بنتی گئی اور ایک دن میں نے انگریزی میں لکھنا شروع کر دیا۔میری تھیوریtheory یہ ہے کہ میں چوبیس برس کی عمر میں کینیڈا آیا تھا کینیڈا میں چوبیس برس رہنے کے بعد جب کینیڈا میں میرا قیام پاکستان کے قیام سے بڑھنے لگا تو انگریزی سے میرا رشتہ مستحکم ہوتا گیا۔ انگریزی میں لکھنے کے باوجود مجھے احساس ہے کہ میں اردو میں کتابیں لکھنے سے پاکستان میں رہنے والے لوگوں کی خدمت کر سکتا ہوں اسی لیے میں نے عالمی ادب کے اردو میں تراجم کیے ہیں جن کی مثالیں میری کتابیں سوغات' بھگوان ایمان انسان' کالے جسموں کی ریاضت' مغربی عورت' ادب اور زندگی' ہر دور میں مصلوب' ایک باپ کی اولاد اور ورثہ ہیں۔

میری یہ بھی خوش قسمتی ہے کہ مجھے محمد آصف جیسے پبلشر اور گوہر تاج جیسے دوست ملے ہیں جو مجھے اردو میں لکھنے کے لیےinspire کرتے رہتے ہیں۔اردو میری پہلی محبوبہ ہے جو میری دوسری محبوبہ انگریزی سے حسد کرتی ہے۔اور میں دونوں ادبی محبوباؤں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

گوہر تاج: آپ کی شاعری کی کتاب 'تلاش' میں آپ کے تخلیقی اظہار کی زبان مرد کی بجائے عورت کی ہے۔ آپ نے بڑی دردمندی سے ان کے دکھوں اور مسائل کو عورت کی زبان میں بیان کیا ہے جو ایک انوکھا تجربہ ہے۔ کیا یہ ایک شعوری کوشش تھی؟

خالد سہیل: میڈیکل سکول کے زمانۂ طالبعلمی میں مجھے لیبر روم میں کام کرنے اور عورتوں کے مسائل کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جس سے مجھے عورتوں سے بہت ہمدردی ہوئی۔ لیڈی ریڈنگ ہسپتال کی پچتر سالہ تاریخ میں وہ پہلا موقع تھا کہ ایک مرد نے زنانہ ہسپتال میں ہاؤس جاب کیا۔

ایک دن میں نے ایک نظم لکھی جس کا نام تھا 'سرخ دائرہ'۔ میں نے اسے جس مشاعرہ میں پڑھا اس میں احمد فراز' محسن احسان' خاطر غزنوی اور احمد ندیم قاسمی جج تھے۔ انہوں نے مجھے پہلا انعام دیا۔ وہ نظم لکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ نظم میں نے عورت بن کر لکھی ہے۔ اسی طرح کئی اور نظمیں عورت بن کر لکھیں۔ یہ فعل لاشعوری تھا۔ بعض دفعہ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے اندر ایک عورت چھپی ہو۔ شاید یہی عورت مجھے عورتوں سے دوستی کرنے اور ان کی سہیلی بننے میں مدد کرتی ہے۔

گوہر تاج: ٦٤ برس کی عمر میں ٦٤ کتابیں تخلیق کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا آپ شہرت کے طالب ہیں یا اپنی تحریروں سے سماج میں تبدیلی لانے کے خواہاں ہیں؟

خالد سہیل: میں نے بچپن میں غربت دیکھی' جہالت دیکھی' ہندوستان کے ساتھ جنگ دیکھی' عورتوں پر ظلم ہوتے دیکھا۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد میں نے ایک بہتر اور پرامن زندگی کا خواب دیکھا اور اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے نفسیاتی معالج بنا تا کہ اپنے مریضوں اور ان کے خاندانوں کی خدمت کر سکوں اور ایک انسان دوست ادیب بنا تا کہ انسانیت کی

خدمت کر سکوں۔ دولت اور شہرت کبھی بھی میرے مقصد نہیں رہے۔
میرے دوست میری عزت کرتے ہیں میرے قارئین مجھے محبت بھرے
خطوط بھیجتے ہیں۔ یہ میری خوش بختی کہ مجھے ماہرِ نفسیات اور انسان دوست
ادیب بن کر انسانیت کی خدمت کرنے کا موقع ملا۔ میں اسی لیے کہتا
ہوں کہ میری تخلیقات دکھی انسانیت کے نام میرے محبت نامے ہیں۔

My creations are my love letters to humanity.

گوہر تاج: آپ اتنا کچھ لکھنے کا وقت کہاں سے نکالتے ہیں؟

خالد سہیل: جہاں تک لکھنے پڑھنے کا وقت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ادب میرا مشغلہ
نہیں جسے میں فارغ وقت میں کرتا ہوں میں ذہنی طور پر ادبی دنیا میں
زندہ رہتا ہوں کیونکہ ادب میرا شوق' میرا جذبہ passion میرا خواب
dream ہے۔

مجھے نوجوانی میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ دو کام شاعروں' ادیبوں' دانشوروں
کی راہ کی رکاوٹ بنتے ہیں۔خاندانی ذمہ داریاں اور ملازمت کی ذمہ
داریاں۔ چنانچہ میں نے بچوں کی ذمہ داری قبول نہیں کی اور ملازمت بھی
ایسی کی جو میرے ادبی کام میں میری مدد کرے۔ان دونوں فیصلوں نے
ادیب بننے کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں میری مدد کی۔

گوہر تاج: آپ کا جملہ ہے کہ ایک مہاجر ادیب کی تیسری آنکھ بھی ہوتی ہے اس سے
کیا مراد ہے؟

خالد سہیل: جب کوئی ادیب دو معاشروں' دو تہذیبوں' اور دو زبانوں میں زندہ رہتا
ہے تو اس کے اندر ایک خاص طرح کی بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ وہ زندگی
کو ایک نئے زاویے سے دیکھتا ہے۔ یہ نگاہ اس سے نیا ادب تخلیق کرواتی
ہے اور اسے دانا بناتی ہے۔ یہ تیسری آنکھ کا کرشمہ ہے' کرامت ہے' معجزہ

ہے۔

گوہر تاج: آپ کا مطالعہ دونوں زبانوں میں ہے آپ مشرق اور مغرب کے ادب میں کیا نمایاں فرق محسوس کرتے ہیں؟

خالد سہیل: میری نگاہ میں مشرق اور مغرب کے ادب میں ایک بنیادی فرق فورمform اور کونٹنٹcontent کا ہے۔مغرب میں فورم کو اور مشرق میں کونٹنٹ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ادبِ عالیہ ان دونوں کو حسیں امتزاج ہوتا ہے۔اردو ادب میں ترقی پسند ادیبوں نے کونٹنٹ پر اور حلقہِ اربابِ ذوق کے جدید ادیبوں نے فورم پر زیادہ توجہ دی کیونکہ وہ مغرب کے ادب سے زیادہ متاثر تھے۔

گوہر تاج: دنیا میں دہشت گردی کی لہر آئی ہوئی ہے۔ اس کے نفسیاتی اور سماجی عوامل کیا ہیں؟ امن کی صورت کیسے نکل سکتی ہے؟

خالد سہیل: یہ ایک گھمبیر سوال ہے جس کا جواب چند جملوں میں دینا مشکل ہے۔میری نگاہ میں جب کوئی آئیڈیولوجیIdeology دہشت گردی اور تشدد کو فروغ دینے لگے تو وہ انسانیت کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔بہت سی جنگیں بڑے اور طاقتور ملکوں کی چھوٹے اور کمزور ملکوں کے resources پر قبضہ کرنے کی سازش ہے۔ امن کی صورت اس وقت نکل سکتی ہے جب گھروں میں اور سکولوں میں بچوں کو یہ پڑھایا اور سکھایا جائے کہ ہم سب ایک ہی خاندان کا حصہ ہیں اور اس خاندان کا نام انسانیت ہے۔ ہمارے دشمن بھی ہمارے رشتہ دار ہیں کیونکہ ہم سب دھرتی ماں کے بچے ہیں۔

گوہر تاج۔ آپ کی تحریروں میں سائنسی طرزِ فکر اور روشن خیالی بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ گھمبیر فلسفے کو سہل زبان میں پیش کرنے کا ہنر بھی کمال کا ہے۔

کیا یہ شعوری کوشش ہے یا قدرتی انداز ہے؟

خالد سہیل: میں ادب میں ابلاغ کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ شاعری میں سہلِ ممتنع کا قائل ہوں جو simple and profound ہوتا ہے۔ میرؔ کا شعر ہے

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات۔۔۔کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

یا غالبؔ کا مصرعہ ہے:

عاشقی صبر طلاب اور تمنا بے تاب

میں نے ادبِ عالیہ کے مطالعہ سے یہ سیکھا ہے کہ اگر شاعر، ادیب اور دانشور نے اپنا ادبی اور نظریاتی ہوم ورک homework کیا ہے تو وہ زندگی کے بڑے سے بڑے فلسفے کو آسان زبان میں پیش کر سکتا ہے۔ میں نے یہ فن میرؔ کی شاعری، ایرک فرام اور برٹنڈ رسل کے مضامین سے سیکھا ہے۔ رسل نے کہا تھا It took me fifty years to write simple

جو شاعر، ادیب اور دانشور عوام کے لیے لکھتے ہیں وہ ایسی زبان میں لکھتے ہیں جسے عوام سمجھ سکیں۔ جب کوئی تحریر بہت مشکل اور گنجلک ہو جاتی ہے تو وہ صرف دانشوروں اور intellectuals, scholars and academicians کے لیے رہ جاتی ہے اس سے عوام استفادہ نہیں کر سکتے۔

سارتر سے کسی نے کہا تھا کہ آپ کی ایک ہزار صفحوں کی کتاب Being and Nothingness کو کسی نے ایک سو صفحوں میں لکھا ہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ سارتر نے مسکرا کر کہا کہ وہ کتاب میں نے تیس سال کی عمر میں لکھی تھی اب میں ستر سال کا ہوں اب میں وہ کتاب لکھتا تو سو صفحوں میں ہی لکھتا۔

شاعر' ادیب اور دانشور کو زندگی اور ادب کا جتنا زیادہ تجربہ ہوتا ہے وہ مشکل سے مشکل مسئلے' نظریے اور آدرش کو عام فہم زبان میں بیان کر سکتا ہے۔ ایسے ادب کی مثال ہمیں صوفیانہ شاعری اور لوک ورثہ میں ملتی ہے۔

گوہر تاج: آپ کی کتاب 'اپنا پنا سچ' جو سوانح عمری کا حصہ ہے اکثر لوگوں کو شاق گزری ہے۔ اتنا سچ لکھنے کی کیا ضرورت ہے جو دوسروں کو تکلیف پہنچائے؟

خالد سہیل: میں نے آج تک کوئی شعر' کوئی افسانہ یا کوئی مضمون کسی کو تکلیف پہنچانے کے لیے نہیں لکھا۔ میرے اندر ایک ادیب بھی ہے اور ایک طبیب بھی ہے جو مریضوں کو ان کی تشخیص بتاتا ہے اور پھر علاج تجویز کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے خاندانی' سماجی اور سیاسی مسائل کی بھی تشخیص کرنی ہوگی تا کہ ہم ان کا علاج تلاش کر سکیں۔

بعض لوگ حقائق سے آنکھیں چراتے ہیں جب آپ ایسے لوگوں کو آئنہ دکھاتے ہیں تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ میرا ایک شعر ہے

زمانہ چھپتا ہے ان شاعروں سے اب خالدؔ
جو شہرِ زیست میں آئے ہیں آئنوں کی طرح

گوہر تاج: سماج کے ارتقا اور تبدیلی کے حوالے سے آپ کی کئی تحریریں ہیں۔ اس عمل میں مذہب کا کیا کردار رہا ہے؟

خالد سہیل: ہر دور میں مذہب کا کردار دو طرح کا رہا ہے۔ سماجی سطح پر اور نظریاتی سطح پر۔ مذہب کے پیروکاروں کا ایک گروہ ایسا ہے جو مذہب کو معاشرے کی بہتری کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ایسے لوگ رفاہی کام کرتے ہیں ۔ ان کی مثال

پاکستان میں عبدالستار ایدھی

ہندوستان میں مدر ٹیریسا
امریکہ میں مارٹن لوتھر کنگ
افریقہ میں ڈیزمنڈ ٹوٹو ہیں۔

ان کے مقابلے میں کچھ مذہبی رہنما ایسے بھی ہیں جنہوں نے شدت پسندی اور دہشت گردی کو فروغ دیا ہے۔ ایسے لوگ انسانیت اور امنِ عالم کے لیے خطرہ ہیں۔ ان کی مثال اسامہ بن لادن ہیں جو ساری دنیا میں خون کی ہولی کھیلتے ہیں۔

مذہب کا دوسرا پہلو نظریاتی ہے۔ مذاہبِ عالم اس دور کی پیداوار ہیں جب فلسفہ، ریاضی اور سائنس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ میری نگاہ میں مذاہب انسانیت کے ماضی کی اور فلسفہ، طب، نفسیات اور سائنس انسانیت کے مستقبل کی عکاسی کرتے ہیں۔ سگمنڈ فرائڈ کا کہنا تھا کہ جوں جوں سائنس کا دائرہ پھیلتا جائے گا مذہب کا دائرہ سکڑتا جائے گا۔

جہاں تک میری تحریروں کا تعلق ہے میں ایک انسان دوست ماہرِ نفسیات Humanist Psychotherapist ہوں جو انسانوں کے دکھوں کو کم اور سکھوں میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ میری تحریریں اسی آدرش کی عکاسی کرتی ہیں۔ ایک سیکولر ہیومنسٹ Secular Humanist کے ناطے میں سمجھتا ہوں کہ مذہب انسانوں کا ذاتی عمل ہے جہاں تک معاشرے کی روایت اور قانون کا تعلق ہے ہر ملک میں تمام انسانوں کو برابر کے حقوق اور مراعات حاصل ہونے چاہئیں۔ خاص طور پر بچوں، عورتوں اور اقلیتوں کو۔

گوہر تاج: آپ نے ذاتی فیملی سے زیادہ فیملی آف دی ہارٹ Family of the Heart کو اہمیت دی ہے۔ کچھ اس کی تخلیق کے بارے میں بتائیں کہ اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

خالد سہیل: میں سمجھتا ہوں کہ ہر شہر میں شاعروں، ادیبوں، فنکاروں اور دانشوروں کو ایک ایسے فورم کی ضرورت ہوتی ہے جہاں وہ اپنے فن کا اظہار کر سکیں اور ہم خیال لوگوں سے مل سکیں۔ ٹورانٹو کینیڈا میں فیملی آف دی ہارٹ اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ ہم بزرگ شاعروں اور ادیبوں کو celebrate بھی کرتے ہیں اور نئے لکھنے والوں کے لیے ایسی ورکشاپ کا بھی اہتمام کرتے ہیں جہاں جونیر لکھنے والے سینیر لکھنے والوں سے ادبِ عالیہ تخلیق کرنے کا فن سیکھ سکیں۔ ہم ایسے سیمینار بھی منعقد کرتے ہیں جہاں سماجی اور سیاسی مسائل پر سنجیدہ مکالمہ ہو سکے۔

گوہر تاج: آپ اتنے مصروف رہنے کے باوجود ڈھیروں لوگوں سے دوستیاں نبھاتے ہیں؟ کچھ ہمیں بھی اس کا گر بتائیں؟

خالد سہیل: مجھے 3Ds کا شوق ہے۔ Driving, Dinner, Dialogue۔ میں دوستوں کو ڈنر پر بلاتا ہوں اور ان سے دل کی باتیں کرتا ہوں۔ یہی دوستی کا راز ہے۔ میرا ایک شعر ہے

آج کل رشتوں کا یہ عالم ہے۔۔۔۔جو بھی نبھ جائے بھلا لگتا ہے۔۔

گوہر تاج: مستقبل کے کیا منصوبے ہیں؟

خالد سہیل: آپ نے مشورہ دیا تھا کہ میں اردو میں نفسیات پر ایک کتاب اور لکھوں چنانچہ میری نئی کتاب۔۔۔لفظوں کی مسیحائی۔۔۔کراچی سے چھپ رہی ہے۔ میں ایک ایسی کتاب بھی لکھ رہا ہوں جس میں پچھلے چالیس سال کے تجربے، مشاہدے، مطالعے اور تجزیے کا نچوڑ ہو۔ اس کا نام The Seeker: Story of Khizr and his search for truth ہے۔ دیکھیں میں اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں کامیاب ہوتا ہوں یا نہیں۔

گوہر تاج: ایک آخری سوال۔ آپ نے 'روحانیات کی نفسیات' لکھنے کا فیصلہ کیسے کیا؟

خالد سہیل: اس کتاب کا سارا کریڈٹ credit میرے کراچی کے پبلشر آصف صاحب کو جاتا ہے۔ وہ کئی مہینوں سے فرمائش کر رہے تھے کہ میں اس موضوع پر کتاب لکھوں۔ شروع میں میں انکار کرتا رہا وہ اصرار کرتے رہے آخر میں نے ان کے اصرار کے آگے گھٹنے ٹیک دیے اور اپنی کتاب Mysteries of Mysticism کے چند ابواب کا ترجمہ کر کے اردو میں ایک کتاب تیار کر دی۔ مجھ پر آصف صاحب کے بہت سے احسانات ہیں۔ یہ میرا ان کو ایک ادبی تحفہ ہے۔ جب میں نے انہیں فون پر خوشخبری سنائی کہ میں نے کتاب لکھ لی ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور ان کی خوشی سے مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ میں ان کے اخلاص اور محبت کی بہت قدر کرتا ہوں۔

O

گوہر تاج: ایک آخری سوال۔ آپ نے 'روحانیات کی نفسیات' لکھنے کا فیصلہ کیسے کیا؟

خالد سہیل: اس کتاب کا سارا کریڈٹ Credit میرے کراچی کے پبلشر آصف صاحب کو جاتا ہے۔ وہ کئی مہینوں سے فرمائش کر رہے تھے کہ میں اس موضوع پر کتاب لکھوں۔ شروع میں میں انکار کرتا رہا وہ اصرار کرتے رہے آخر میں نے ان کے اصرار کے آگے گھٹنے ٹیک دیے اور اپنی کتاب Mysteries of Mysticism کے چند ابواب کا ترجمہ کر کے اردو میں ایک کتاب تیار کر دی۔ مجھ پر آصف صاحب کے بہت سے احسانات ہیں۔ یہ میرا ان کو ایک ادبی تحفہ ہے۔ جب میں نے انہیں فون پر خوشخبری سنائی کہ میں نے کتاب لکھ لی ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور ان کی خوشی سے مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ میں ان کے اخلاص اور محبت کی بہت قدر کرتا ہوں۔